سیلاب صرف نقصان ہی کا سبب نہیں بنتا
تہذیب و تمدن اور رسم و رواج پر بھی اثر انداز ہوتا ہے
COMPUTER KINGS QUETTA
جونک
محی الدین نواب

میں انسانوں کی دنیا میں جونک کو نر کہتی ہوں۔

اے میرے جونک!

تو کب تک میرے وجود سے لپٹا رہے گا۔

تو نے ایک کنواری کا خون چوس کر اسے عورت بنا دیا۔

پھر تو نے عورت کا لہو چوس کر اسے ماں بنا دیا۔

یہی تجھ سے غلطی ہو گئی۔

بچے کو دودھ پلانے والی ماں

کسی کو اپنا خون چوسنے نہیں دیتی۔

جس خون سے میرے بچے کے لئے دودھ بنتا ہے۔

تو اسے چوسنے آیا ہے؟ آ۔ آ

میری محبت کے کچے گھڑے!

میں تجھے چناب کی لہروں میں لے چلوں۔

جونک اور عاشق میں برائے نام فرق ہوتا ہے۔ سیلابی کیچڑ اور دلدل میں پیدا ہونے والی جونک بدن سے چمٹ جائے تو خون چوستی رہتی ہے۔ جب تک خون پی پی کر مر نہ جائے آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

عاشق کبھی پیچھا چھوڑ دیتا ہے کبھی چمٹ جاتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے پھر جونک بن جاتا ہے کبھی حسن کو پیار سے مانگتا ہے' کبھی اپنا حق سمجھ کر چھین لیتا ہے۔ لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔

کوئی درد نہ ہو تو ہمدرد بن کر آتا ہے اور چپکے چپکے زندگی میں درد کا ذخیرہ کرتا رہتا ہے جونک اوپر سے لہو چوستی ہے عاشق رگوں میں لہو بن کر دوڑتا ہے۔ بہت دھیرے دھیرے حسن کے اندر پرورش پاتا ہے۔ پیار کے نام پر پہلے اپنا عادی بناتا ہے پھر باندی بناتا ہے۔

فیروزہ ریسیور کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "میری سلمٰی آپا تمہاری بھابی ہیں۔ بیشک میں آپا کے رشتے سے تمہارے گھر آتا ہوں لیکن بخدا تمہیں دیکھنے کے بہانے آتا رہتا ہوں۔"

وہ بولی "چودھری صاحب! بار بار پھیرے لگانے سے تمہارے پھیر میں نہیں آؤں گی۔"

"مجھے چودھری صاحب کیوں کہتی ہو؟ نام لے کر مخاطب کرو۔"

"تمہارا نام اکبر علی ہے۔ علی ایک معتبر نام ہے اور تم جھوٹے دغاباز ہو۔"

"غصہ تھوک دو۔ چلو علی نہ کہو' اکبر تو کہہ سکتی ہو؟"

"جب میں اللہ اکبر کہتی ہوں تو چودھری کو اکبر نہیں کہہ سکتی۔ کیا تمہاری آپا کو فون پر بلاؤں؟"

"پلیز نہیں۔ بڑی مشکلوں سے تم فون پر ملی ہو۔ صاف صاف بتاؤ مجھ سے کتراتی کیوں ہو؟"

"کیا بتانا ضروری ہے کہ تم ایک بیوی کے شوہر اور دو بچوں کے باپ ہو؟"

"شوہر اور باپ بننا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"کیا اپنی شریک حیات کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نیکی ہے؟"

"فیروزہ! یقین کرو۔ میں نے شادی کی رات ہی صغریٰ سے کاغذ لکھوالیا تھا کہ جب بھی میری آئیڈیل لڑکی مجھے ملے گی۔ میں دوسری شادی کروں گا اور وہ اعتراض نہیں کرے گی۔ تم جب چاہو وہ کاغذ مجھ سے لے کر پڑھ سکتی ہو۔"

"وہ دلہن پہلی رات یہ اجازت نامہ لکھنے پر راضی کیسے ہوگئی تھی؟"

"یہ تو ہمارا پورا خاندان جانتا ہے کہ میں صغریٰ کو کبھی پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ زمین' جائداد کا معاملہ تھا۔ میں شادی نہ کرتا تو وہ اپنے حصے کی زمینیں لے کر دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔"

"میں پوچھ رہی ہوں تم نے اجازت نامہ کیسے لکھوالیا؟"

"تم نے صغریٰ کو نہیں دیکھا ہے وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتی ہے اور بے چاری کے پاس نہ حسن ہے نہ زیادہ تعلیم ایک اچھی بیوی ضرور ہے۔ اس نے اس ضمانت پر کاغذ لکھ دیا ہے کہ میں اسے کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ وہ پنڈ دادن خان والی حویلی میں پڑی رہے گی۔"

"عورت اپنے خاوند کے گھر کو جنت بناتی ہے تم نے بیوی کی جنت پانی میں بنائی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے جو ظلم مجھ پر ہوا ہے اسے سمجھو۔ میں اٹھارہ برس کا تھا ابا جان نے جبراً میری شادی کرادی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ صغریٰ کی جائداد ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں شاعرانہ جذبوں کا مالک ہوں۔ مجھے کسی سے محبت کرنے کی مہلت نہیں ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو بچوں کا باپ بن گیا۔"

وہ خاموش رہی چودھری اکبر علی اس پہلو سے درست کہہ رہا تھا کہ شادی واقعی جاگیر دارانہ حساب کتاب سے ہوئی تھی۔ جس طرح غریب کسانوں کو تمام عمر کھیتوں کھلیانوں سے باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح اکبر علی کے آگے زمین جائداد کا بند باندھ دیا گیا لیکن جوانی میں کہیں نہ کہیں سے حسن و شباب کا ریلا آتا ہے تو سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ فیروزہ اسے قبول کرتی یا نہ کرتی یہ اعزاز اسے حاصل ہو رہا تھا کہ وہ اپنے سیلابی حسن و شباب سے چودھری کو توڑ پھوڑ رہی ہے۔

وہ کہہ رہا تھا "میرے ساتھ بیوی بچوں کا ذکر ہوتا ہے تو سننے والے سمجھتے ہیں میں عمر رسیدہ ہوں۔ ہمارا معاشرہ ہمارے لوگ عجیب ہیں۔ باپ بنتے ہی بندے پر بزرگی طاری کردیتے ہیں جبکہ میں ابھی چوبیس سال کا ہوں۔ یہ عمر شوہر اور باپ بننے کی نہیں آزادی سے ہنسنے کھیلنے اپنے محبوب کے ساتھ پھول چننے اور محبتوں کے آسمان پر اڑنے کے لیے ہوتی ہے۔"

وہ تجاہل عارفانہ سے بولی "تم پھول چننے اور آسمان پر اڑنے کے لیے میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"دماغ پیچھے ہوتا ہے یہ جانتی ہو ناکہ انسانی کھوپڑی کے پچھلے حصے میں دماغ ہوتا ہے؟ اس حوالے سے دل تمہارا آگے آگے ہے اور دماغ پیچھے پیچھے۔ آج کسی وقت تنہائی میں سر جھکا کر سوچو تو سمجھ لوگی کہ میں تمہاری ضرورت ہوں اور ضرورت کو جتنا پیچھے چھوڑو اتنا ہی وہ آگے آتی ہے۔"

فیروزہ نے چوٹ کی "دو بچوں کے باپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"پلیز بچوں کا حساب نہ کرو میری عمر اور میری زندہ دلی دیکھو۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "مجھے اپنے آگے صرف تمہارے بیوی بچے دکھائی دیتے ہیں۔"

"میری جان! آنکھ صرف آگے دیکھتی ہے۔ عقل آگے بھی دیکھتی ہے اور پیچھے بھی۔ مجھے عقل سے سمجھو۔"

"دیکھو آئندہ مجھے میری جان نہ کہنا۔ یہ مجھے نہایت ہی گھٹیا اور بھونڈا انداز تخاطب لگتا ہے۔"

"میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ سنا ہے محبت کے کچھ آداب ہوتے ہیں آئندہ تم سکھاتی رہوگی تو میں سیکھتا رہوں گا۔"

"جی نہیں میں آئندہ فون پر نہیں آؤں گی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ تم بھائی بہن کی سازش ہے بھابی کے فون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ مجھے اٹینڈ کرنے کو کہتی ہیں۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ تم میرے لیے گھنٹی بجارہے ہو۔ وہ کسی نہ کسی بہانے مجھے فون پر بھیج دیتی ہیں۔ بس یہ آخری بار اٹینڈ کر رہی ہوں۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا۔ ایسا کرو ایک بار مجھ سے کہیں ملاقات کرو۔ میں جو باتیں فون پر نہیں کرسکتا انہیں روبرو کہنے کا موقع دو۔ اگر میں اپنی محبت سے تمہیں قائل نہ کرسکا تو اپنی بدنصیبی کا یقین کرلوں گا۔"

وہ ریسیور کان سے لگائے بیٹھی تھی سر جھکا کر سوچ میں پڑگئی۔ وہ کسی جگہ ملاقات کرنے کی ہامی بھر کر اس کا حوصلہ بڑھانا اور اپنی قدروقیمت کم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا "خاموش کیوں ہو؟ اگر جھجکتے اور شرماتے ہوئے ہاں کہنے میں دیر ہورہی ہے تو بے شک دیر کرو۔ میں ریسیور کان سے لگائے یہاں کھڑے کھڑے زندگی گزار دوں گا مگر پلیز انکار نہ کرنا۔"

اس نے انکار نہیں کیا اقرار بھی نہیں کیا۔ خاموشی سے ریسیور رکھ دیا۔ خاموشی صرف نیم رضامندی کی علامت نہیں ہوتی۔ خاموشی سے بڑے بڑے مقدمے مدتوں تک ملتوی رکھے جاتے ہیں لیکن چوہدری اکبر علی سنگین مقدمات سے بھی بڑا تھا۔ چھ فٹ کا گھبرو جوان بڑی سنگینی سے اس کے حواس پر چھاجاتا تھا۔ اس کا چوڑا سینہ جہلم کے چوڑے پاٹ کی طرح یہاں سے وہاں تک کشادہ تھا۔ اس سینے سے لگنے کا خیال منہ زور لہروں کی طرح بہا کر

لے جاتا تھا۔ وہ ہوش مندی سے سوچتی تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اس کے باوجود اس کے لیے باؤلی ہوتی رہتی تھی۔

ابھی حال ہی میں اس کی ایک سہیلی نے ایک شادی شدہ شخص سے محبت کی تھی پھر اس کی ایسی دیوانی ہوئی تھی کہ والدین کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کرلی اس سے کچھ عرصہ پہلے محلے کی ایک لڑکی بھی ایک بے چاری بیاہتا پر سوکن بن کر گئی تھی۔ فیروزہ نے اپنے جہلم شہر میں ایسی کئی لڑکیاں دیکھی تھیں جو سیکنڈ ہینڈ مردوں پر جان دیتی تھیں۔ بوڑھی عورتیں حیرانی سے کہتی تھیں۔ "یہ آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ بیویوں اور بچوں والوں کو آخر کیا دیکھ کر پسند کرلیتی ہیں؟ کیا خاندان میں اور اتنے بڑے ملک میں کنوارے نہیں ہیں؟"

ایک ملک ہی میں کیا' پوری دنیا میں کنوارے ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ کوئی مخصوص قسم کی آسیبی ہوا چلی ہے۔ یہ باؤلیاں کنواروں کو گھاس ہی نہیں ڈالتیں۔ فیروزہ بھی پہلے ناگواری سے یہی سوچتی تھی۔ آخر کوئی شادی شدہ مرد کیسے پسند آجاتا ہے؟ یہ دل اور دماغ کی کمزوری ہے۔ یہ محبت نہیں ہوتی پرائے مرد کو حاصل کرنے کی بے لگام خواہش ہوتی ہے۔ اخلاقی کمزوری یہ سوچنے نہیں دیتی کہ وہ دوسری عورت اور اس کے بچوں کا حق مارنے جارہی ہے۔

فیروزہ نے چودھری اکبر علی کو پہلی بار اپنے بھائی جواد حسین کی شادی میں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غضب کی مردانگی تھی۔ اسے دیکھ کر کچھ ہوتا تھا۔ کیا ہوتا تھا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے وہ براتیوں کی بھیڑ میں اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہی اور معلوم کرتی رہی۔ اس عمر میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو معلوم ہوکر بھی معلوم ہونے کو رہ جاتی ہیں اور بے چینی میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔

نظروں کا تبادلہ ہوتا رہا اور وہ نظریں چراتی رہی۔ ایک بار وہ اپنی سلمیٰ آپا سے ملنے آیا تو تنہائی میں موقعہ پاکر فیروزہ سے بولا۔ "تمہاری نگاہوں سے کبھی معنی جھلکتے ہیں اور کبھی یہ بے معنی سی لگتی ہیں۔ ایسی بے ایمانی سے نہ دیکھا کرو۔"

وہ مسکرا کر بھاگتی ہوئی کچن میں سلمیٰ بھابی کے پاس آگئی۔ بھابی نے پوچھا "کیا تمہارے پیچھے پولیس ہے؟ بھاگنے اور ہانپنے کا انداز یہی بتا رہا ہے۔"

وہ سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "آپ کے بھائی بڑے وہ ہیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ... آپ' آپ انہیں منع کردیں۔"

"کس بات سے منع کردیں؟"

"یہی کہ وہ ایسی ویسی باتیں نہ کریں۔"

"ایسی ویسی باتیں کیا ہوتی ہیں؟"

"جائیے بھابی! میں نہیں بولتی۔ آپ بھی مجھے چھیڑ رہی ہیں۔"

"آپ بھی کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھائی بھی چھیڑ رہا تھا؟"

وہ شرما کر جانا چاہتی تھی۔ بھابی نے ہاتھ پکڑ لیا پھر کہا "ساز چھیڑنے کے لیے ہی ہوتا ہے میرے دیور کو یہ حق دے دو۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر دوڑتی ہوئی کچن سے چلی گئی۔ سلمیٰ سوچنے لگی۔ "بھائی کا دل اس پر آگیا ہے۔ کس نیت سے آیا ہے؟ شادی کی نیت سے یا تفریح کی؟ جہاں جاگیرداروں کا دل آتا ہے وہاں تفریح اور عیاشی کا شبہ پہلے ہوتا ہے۔ میرے دیور کی شادی ہوچکی ہے۔ اب یہ جو چاہتا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا سسرال ہے۔ میری نند کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو میں سسرال کی رہوں گی نہ میکے کی۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خود ہی فیروزہ سے کہا تھا کہ ساز چھیڑنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ میرے دیور کو یہ حق دے دو۔ وہ چند لمحوں کے لیے بھول گئی تھی کہ سسرال میں ہے اور اپنی نند سے ایسا کہہ رہی ہے۔ یہ اپنے اپنے مزاج اور عادت کی بات ہوتی ہے۔ وہ میکے میں اپنے باپ اور بھائی کی رنگ رلیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک بار اس کی سہیلی جہلم شہر سے پنڈ دادن خان والی حویلی میں آئی تھی۔ بھائی نے اس میں دلچسپی لی تو سلمیٰ نے سہیلی کو بھی کچھ اسی طرح ترغیب دی تھی کہ ساز چھیڑنے کے لیے ہوتا ہے چھیڑنے والے کو چھیڑنے دو۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی کچن سے باہر آئی۔ یہ سبق وہ اپنی نند کو نہیں پڑھانا چاہتی تھی۔ اس میں سراسر اپنا ہی نقصان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر آکر رک گئی۔ اندر اس کا میاں جواد حسین اس کے بھائی اکبر علی سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

جواد حسین اور فیروزہ کے والد چودھری عنایت حسین بھی ایک جاگیردار تھے لیکن سلمیٰ اور اکبر علی کے والد چودھری قاسم علی سے کمتر تھے لیکن دولت مندی میں جوڑ کا توڑ تھے۔ فیصل آباد سے آنے والے زرعی آلات کے بہت بڑے ڈیلر تھے اور بیٹا جواد حسین منگلا ڈیم میں اسسٹنٹ انجینئر تھا۔ قابلیت کے لحاظ سے وہ ایسا ہی تھا جیسے اکثر سرکاری افسران ہوتے ہیں مگر اپنوں اور بیگانوں میں ایک انجینئر کی ٹور اور شان ہوگئی تھی۔

وہ اپنے سالے کے ساتھ قہقہے لگاتے لگاتے بیوی کو دیکھ کر چپ ہوگیا۔ فوراً اٹھ کر یوں کھڑا ہوگیا جیسے اعلیٰ افسر دروازے پر آگیا ہو پھر وہ بولا "سلمیٰ رانی! وہاں کیوں رک گئیں، اندر آؤ۔"

وہ اپنے میکے سے سلمیٰ بانو کے نام سے بیاہ کر آئی تھی مگر میاں نے پہلی رات اسے سپنوں کی رانی، زندگی کی رانی، رات کی رانی، دن کی رانی اور دل کی رانی کہتے کہتے صبح کردی والدین کے سامنے بھی اسے سلمیٰ رانی کہا تو یہی نام مستقل ہوگیا۔ والد نے کہا ہماری بہو سچ

مچ رانی ہے لیکن والدہ جل بھن گئیں۔ بستر سونے کے لیے ہوتا ہے بیٹے نے اسے اوڑھ لیا تھا۔

وہ کمرے میں آکر میاں سے بولی "میں اکبر سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

جواد نے کہا "ہاں ہاں۔ ضرور ضرور میں امی کے پاس جارہا ہوں۔"

وہ تابعدار چند دنوں میں ہی رانی کا موڈ اور مزاج سمجھنے لگا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بھائی سے باتیں کرنے کے لیے تنہائی کیا ضروری ہے اور شوہر سے بھلا کیا چھپایا جارہا ہے؟ وہ بیوی کو خوش کرنے کے لیے وہاں سے چلا گیا۔

چودھری اکبر علی نے کہا "کمال ہے۔ جواد بھائی اسی کمرے میں پیدا ہوئے ہوں گے، اسی کمرے میں بچپن گزارا ہوگا۔ اسی میں جوان ہوئے ہوں گے۔ اسی میں تمہیں دلہن بنا کر لائے اور تمہاری ایک بات پر اسی کمرے سے نکل گئے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ عورت دا بندہ کتھے وی نہ بندا۔"

"میرے میاں کی بات نہ کرو۔ اپنی بات کرو۔ یہ فیروزہ کے ساتھ کیا چکر چلا رہے ہو۔ کیا مجھے یہاں سے طلاق دلاؤ گے؟"

"آپا! میری آپا کیوں لال پیلی ہورہی ہو۔ یہ میری حویلی نہیں ہے کہ اپنا اصلی رنگ دکھاؤں گا۔ تمہارا سسرالی معاملہ ہے اس لیے مجھے شرافت اور تہذیب کے دائرے میں اس سے عشق ہوگیا ہے۔ میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"تمہارے عشق کا ڈراپ سین کیا ہوگا؟ کیا اس سے شادی کروگے؟"

"ہاں، اسے جب سے دیکھا ہے نیند حرام ہوگئی ہے، شادی ضرور کروں گا۔"

"یہ ہماری ٹکر کا خاندان ہے۔ فیروزہ کے لیے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آتے ہیں۔ میرا سسرا اسے صغریٰ پر سوکن بنانے والی بات برداشت نہیں کرے گا۔ پھر تمہارے لیے یہاں کے دروازے بھی بند کردیے جائیں گے۔"

"آپا! ہم اپنی جاگیر میں بیٹھ کر کسی کانے سیاست دان کو اسمبلی میں پہنچا دیتے ہیں تو کیا مجھ جیسا سیکنڈ ہینڈ داماد اس خاندان میں نہیں آسکے گا؟"

سلمیٰ نے پریشان ہوکر پوچھا "تم کوئی گڑبڑ کرنا چاہتے ہو؟"

"ابھی نہیں جب بات نہیں بنے گی تو گڑبڑ ہوگی۔"

"بات کیسے بناؤ گے؟"

"پہلے اپنے طور پر فیروزہ کو راضی کروں گا۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مجھے پسند کر رہی ہے۔"

"وہ تمہیں کنوارا سمجھ رہی ہے۔"

"کنوارا نہ سمجھے آوارہ سمجھے ایک بار دل میں جگہ بن جائے تو عورت ہر حال میں قبول کرلیتی ہے۔"

"دیکھو اکبر! بات بگڑ گئی تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔"

"تم میری بات مانتی رہو اور جواد بھائی سے اپنی باتیں منواتی رہو تو اس گھر کے دو ووٹ میرے حق میں ہو جائیں گے تیسرا ووٹ فیروزہ سے حاصل کرلوں گا۔ تمہاری ساس اپنے بیٹے جواد کو جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس لیے وہ بھی رفتہ رفتہ بیٹے اور بیٹی کی رضامندی سے جھک جائے گی۔ ایک بڑے میاں رہ جائیں گے ان سے آخر میں نمٹ لیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی میں جواد سے تمہارے اور فیروزہ کے رشتے کی بات نہیں کروں گی۔ پہلے مجھے یہ دکھاؤ کہ فیروزہ تم سے راضی ہے۔"

"تمہیں جلد ہی فیروزہ کی رضامندی معلوم ہوجائے گی۔ میں نے اتنے دنوں میں معلوم کیا ہے کہ وہ کالج جانے کے لیے نو بجے گھر سے نکلتی ہے۔ ایک بجے واپس آتی ہے۔ اس لیے دوپہر کے دو بجے تمہارے فون کی گھنٹی بجے تو تم کسی کام کا بہانہ کرکے فیروزہ کو فون اٹینڈ کرنے کے لیے کہنا۔ آنکھوں کے راستے جگہ بناچکا ہوں اب فون پر کانوں کے راستے دل میں جگہ بناؤں گا۔"

فیروزہ باپ کے ساتھ کار میں جاتی تھی۔ چودھری عنایت حسین اسے کالج ... ڈراپ کرکے اپنے آفس اور شو روم چلے جاتے تھے۔ ایک بجے اسے کالج سے گھر لاکر چھوڑتے تھے پھر دوپہر کا کھانا کھاکر واپس جاتے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اس لیے اکبر علی کو اس سے باہر ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ابتدا میں فون کے ذریعے ہی محبت کا چارا ڈالتا رہا لیکن جلد ہی فیروزہ کو معلوم ہوگیا کہ اس کی ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ بھلا اتنی قریبی رشتے داری میں بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ اس نے سلمٰی بھابی سے پوچھا "آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی؟"

وہ بولی "نہ تم نے کچھ پوچھا نہ میں نے چھپایا تم پوچھتیں تو میں بتاتی۔"

"آپ ہمارے گھر کی بہو ہیں۔ آپ کو اپنے میکے کی اتنی اہم بات خود ہی بتانا چاہیے تھی۔ تعجب ہے امی ابا آپ کا رشتہ مانگنے گئے وہاں بھی کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ صغریٰ نام کی کوئی آپ کی بھابی ہے۔ آپ کی شادی میں اور ہمارے ہاں ولیمے میں بھی وہ بے چاری اور اس کے بچے نظر نہیں آئے۔ آخر یہ رازداری کس لیے؟"

"کوئی رازداری نہیں ہے۔ صغریٰ جاگیر کے تنازع میں میرے بھائی کے سر پڑگئی تھی۔ پھر وہ صورت شکل سے اور طور طریقوں سے اس قابل نہیں ہے کہ اسے کسی محفل یا تقریب میں لے جایا جائے اور صاف بات یہ ہے کہ میرا بھائی اپنی پسند سے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے ہم نے پہلی کی پبلسٹی نہیں کی۔"

"جب آپ نے دیکھا کہ میں آپ کے بھائی کو چاہنے لگی ہوں تو آپ نے اب مجھے اس راز میں شریک کیا ہے۔"

"اکبر نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے تمہیں ہمراز بنایا جائے۔ جب تم رازدار بن جاؤگی اور اکبر کو قبول کروگی تو امی اور ابا کو بھی سب کچھ بتا دیا جائے گا۔"

"آپ اپنے پیارے بھائی سے کہہ دیں کہ وہ مجھے قبول نہیں ہے۔ آئندہ میں فون پر بھی اس فریبی سے بات نہیں کروں گی۔"

"یہ بات تم خود ہی اس سے فون پر کہہ دینا۔"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔"

"بات تو تم نے خود بڑھائی ہے۔ عورت حوصلہ نہ دے تو مرد پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ تم نے اسے پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔ اپنے قریب آنے کا سگنل دیتی رہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی اصلیت چھپا رہا ہے۔"

"یہ میرے بھائی کی انتہائی شرافت ہے کہ تم سے شادی کرنے سے پہلے تمہاری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ وہ فریب نہیں دے رہا ہے پھر بھی اسے فریبی کہہ رہی ہو۔"

سلمٰی نے اسے قائل کردیا کہ چودھری اکبر علی اسے دل و جان سے چاہتا ہے اس لیے فریب نہیں دے رہا ہے' اگر وہ دھوکے سے شادی کرکے لے جاتا اور بعد میں کبھی بھید کھلتا تو وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اس کا کیا بگاڑ لیتی؟

پھر فون پر چودھری اکبر نے بھی اسے قائل کیا اپنا دکھڑا سنایا کہ اس نے بہت مجبور ہوکر صغریٰ سے شادی کی تھی اس کی زندگی میں کوئی محبت کرنے والی نہیں آئی۔ ایک وہ آئی ہے تو اس سے بدظن ہو رہی ہے۔

اگرچہ وہ فون پر اکبر سے طنزیہ اور سخت لہجے میں بول رہی تھی۔ تاہم چپ چاپ پگھل رہی تھی اس گبھرو کو دیکھ کر اور فون پر اس کی آواز سن کر اندر کچھ ہونے لگتا تھا۔ موسم بدلنے لگتا تھا۔ کچھ جانے انجانے جذبوں کی گرم ہوا چلنے لگتی تھی وہ کسی جگہ ملنے کی فرمائش کر رہا تھا۔ اس بات پر اُس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا تھا۔ ڈر تھا کہ دوسری بار فرمائش سنتی تو جذب کے عالم میں ہاں کہہ دیتی۔

دیوانگی میں منہ سے ہاں نکل جاتی ہے۔ ہوشمندی میں کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ اسی لیے اس نے کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ بیوی بچوں والوں پر مرنے والیوں کو حقارت سے دیکھتی آئی تھی۔ آئینے میں دیکھ کر سوچ رہی تھی خود کو حقارت سے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ وہ شخص جو دل و دماغ پر چھاگیا ہے اسے اپنے اندر سے کیسے نوچ کر پھینک دے۔ اس کا متبادل کہاں سے لائے؟

یوں سوچنے سے یہ بات ذہن میں آئی کہ وہ دنیا میں ایک ہی نمونہ نہیں ہے' ایسے قد اور پہاڑ جیسے جوان شہر میں اور بھی ہوں گے۔ لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگی۔ آخر اس میں کیا بات ہے، جس سے دل کھنچا جاتا ہے؟
یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی کسی کو کیوں پسند آجاتا ہے۔ پسندیدگی کے پیچھے کیا عوامل ہوتے ہیں؟ آج کے جوان ان حقائق کا تجزیہ نہیں کرتے کسی کو ٹھونک بجا کر پسند نہیں کرتے۔ بس کوئی اچھا لگتا ہے دل اسے مانگتا ہے تو عشق شروع کردیتے ہیں۔

اس معاملے میں دل بڑا نادان ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھیں اچھی لگتی ہیں تو آنکھوں پر شاعری فرماتا ہے۔ کسی کے لب و رخسار پر آہیں بھرتا ہے۔ کسی آواز اور لہجے میں ایسی مردانگی ہوتی ہے کہ دل اس کی مٹھی میں چلا جاتا ہے۔ فیروزہ کے دل نے کہا "یہی بات ہے، وہ ایک بات کہہ کر چپ ہوتا ہے تو اس کی آواز دیر تک میرے دل میں بجتی رہتی ہے۔"

وہ اپنے دور تک پھیلے ہوئے خاندان میں اچھے اونچے پورے کئی جوان دیکھ چکی تھی لیکن دل میں دھمکنے والی آواز والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے بند آنکھوں کے پیچھے اپنے چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد کو بلا کر دیکھا۔ انہیں جانچا پرکھا۔ ان کی آوازیں سنیں لیکن چودھری اکبر علی کے سامنے ان سب کی آواز بیٹھ جاتی تھی۔ اس کا دل بھی بیٹھ جاتا تھا اور اسی سیکنڈ ہینڈ کے گلے پڑنے کے لیے ضد کرتا تھا۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں۔

دل کی آوارگی نہیں جاتی
عقل کی روک تھام جاری ہے

جہلم شہر سے ملازمین کو منگلا ڈیم لانے اور واپس لے جانے کے لیے سرکاری ٹرانسپورٹ کا انتظام تھا۔ اس روز سلمٰی نے جواد سے کہا "میں بھی ڈیم تک سیر کرنے جاؤں گی۔ میں نے اکبر سے گاڑی لی ہے آپ اسے ڈرائیو کریں گے۔"

وہ خوش ہوکر بولا "تم میرے بغیر نہیں رہتیں۔ میری ڈیوٹی کے وقت بھی مجھے نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔"

اس نے دل میں سوچا "میں پاگل نہیں ہوں کہ دن رات ایک ہی ریکارڈ بجاتی رہوں اور سنتی رہوں" پھر وہ مسکرا کر بولی "آپ نے تو مجھے پاگل بنادیا ہے، میرا بس چلے تو روز ہی آپ کے ساتھ جاؤں لیکن ڈیوٹی کے وقت ڈسٹرب کرنا بیوی کی نادانی ہوتی ہے۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں تو ڈیوٹی کے وقت بھی تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں اسی لیے دن میں دو بار وہاں سے فون ضرور کرتا ہوں۔"

"سرکاری افسران کی ڈیوٹی یہی ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے ملک میں اتنے ڈیم نہیں ہیں جتنے ڈیم فول افسران ہیں۔"

"آں؟" وہ ذرا جھینپ کر بولا "کیا تم مجھے کہہ رہی ہو؟"

"توبہ ہے۔ کبھی عقل سے بھی سمجھا کریں، میں محبت کرنے والی بیوی ہوں بھلا آپ کو ایسا کہہ سکتی ہوں۔ سرکاری ملازمین کے متعلق یہ میری نہیں عوامی رائے ہے۔ بہتان سب کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا۔"

وہ کوٹھی سے باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔ جواد نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ بڑی مہنگی کار ہے۔ میرے سالے کی کیا بات ہے، اس نے اپنی گاڑی ہمیں دے دی۔"

"چلانے کے لیے دی ہے۔ آپ کی اوقات ایسی نہیں ہے کہ کبھی میرے لیے ایسی گاڑی خرید سکیں۔ گھر میں جو گاڑی ہے سنا ہے ابا جان اسے دس برس سے چلا رہے ہیں۔ توبہ ہے، کن کنجوسوں کے خاندان میں آگئی ہوں۔"

"بات کنجوسی کی نہیں ہے ابا جان نمائشی چیزیں خریدنے سے زیادہ جائداد خریدتے

رہتے ہیں۔ یہاں زرعی آلات کا کارخانہ کھولنے کی فکر میں ہیں۔"

"میں چاہوں تو یہ بارہ لاکھ روپے کی گاڑی میری ہو سکتی ہے۔"

وہ حیرانی اور خوشی سے بولا "کیا کہہ رہی ہو؟ کیا اکبر یہ گاڑی تمہیں دے سکتا ہے؟"

"بے شک۔ وہ میرا بھائی ہے۔ اگر میں اسے محبت سے کچھ دوں گی تو وہ بھی مجھے بہت کچھ دے سکتا ہے۔"

"کیا تم اسے کوئی تحفہ وغیرہ دینا چاہتی ہو؟"

"اس کی ایک خوشی پوری کرنے کا مسئلہ ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

جواد نے تعجب سے سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اور تمہارے میکے والوں نے اگرچہ چھپایا ہے پھر بھی مجھے اوپر ہی اوپر سے معلوم ہو چکا ہے اکبر کے بیوی بچے ہیں۔"

وہ تنک کر بولی "ہیں تو کیا ہوا؟ میرے بھائی نے کوئی گناہ کیا ہے؟ منکوحہ عورت اور جائز بچے رکھنا کیا جرم ہے؟"

"پلیز ناراضگی سے نہ بولو۔ تم ناراض ہوتی ہو تو ایسا لگتا ہے میری قیمتی چیز چھن گئی ہے۔"

"آپ میرا اتنا خیال بھی رکھتے ہیں اور طعنے بھی دیتے ہیں۔"

"طعنہ نہیں دے رہا تھا۔ شکایت کر رہا تھا۔ میں تم پر قربان ہونے والا خاوند ہوں۔ مجھ سے اپنے میکے کا راز نہیں چھپانا چاہیے تھا۔"

"راز واز کچھ نہیں ہے۔ ہمیں شرم آتی ہے اس لیے بات چھپاتے ہیں۔"

"یہی بتادو کہ شرم کیوں آتی ہے؟"

"آپ کو اپنا مجازی خدا مان کر بتا رہی ہوں، وعدہ کریں یہ بات آپ اپنی امی ابا کو اور فیروزہ وغیرہ کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں، اگر اپنی جان سے زیادہ عزیز سلمٰی رانی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گا تو ابھی ایکسیڈنٹ میں مارا جاؤں گا۔"

وہ بھڑک کر بولی "آپ کا دماغ چل گیا ہے اس گاڑی میں تو میں بھی بیٹھی ہوں۔ آپ کے ساتھ میں بھی ایکسیڈنٹ میں مروں گی گاڑی روکیں۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی فوراً گاڑی روکی پھر پوچھا "کیا ہوا؟"

"خدا کا شکر ہے ایکسیڈنٹ نہیں ہوا پہلے آپ قسم واپس لیں پھر گاڑی اسٹارٹ کریں۔"

وہ کہنے لگا "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر..."

وہ جھلا کر بولی "کیا آپ عدالت میں ہیں کہ خدا کو بار بار حاضر و ناظر جان رہے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں توبہ کریں اللہ سے معافی مانگیں۔"

وہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے بولی "کان پکڑیں، میں جو کہوں، وہ کہتے جائیں۔"

جواد نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ سلمٰی نے کہا "یاخدا! مجھ سے بھول ہو گئی آئندہ حادثے اور موت والی باتیں نہیں کروں گا۔ مجھے ہر حادثہ اور ہر بلا سے محفوظ رکھ آمین۔"

وہ دہرانے لگا "یا خدا! مجھے ہر حادثہ اور..."

وہ ڈانٹ کر بولی "مجھے کا مطلب آپ نہیں میں ہوں میرے لیے دعا مانگیں۔"

وہ بولا "میری سلمٰی رانی کو ہر حادثہ اور ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ آمین۔"

وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی "اللہ خیر کرے۔ اب چلیں اور احتیاط سے چلائیں۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم موت سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

"پتا نہیں کیوں موت کے خیال سے ہی قبر کی تاریکی اور گوشت کھانے والے کیڑے یاد آتے ہیں، کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔"

وہ دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی "ارے یہ کیا؟ رو کیوں رہی ہو؟"

وہ روتے ہوئے بولی "دنیا کا کوئی فرد اپنی موت پر نہیں روتا کیونکہ اپنی موت کے بعد اپنے اوپر رونے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے لیکن میں اکثر اپنے سامنے اپنی لاش دیکھتی ہوں اور روتی رہتی ہوں۔"

"ہم کچھ اور باتیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں یہ موت کا ذکر کیسے آگیا۔ پلیز! اپنا موڈ اور موضوع بدلو۔"

وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اور اُس کے میکے والوں نے اکبر کی پہلی بیوی اور بچوں کو کیوں چھپایا ہے؟ اگر وہ منکوحہ ہے تو پھر شرم کی کیا بات ہے؟

بڑی دیر تک کار میں خاموشی رہی راستہ گزرتا رہا پھر سلمٰی نے کہا "صغریٰ طوائف زادی ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا "کون صغریٰ؟"

"اکبر کی منکوحہ۔ ہمارے مرحوم چچا کی بیٹی۔ چچا اس کی ماں کو منڈی سے لائے تھے۔ اپنی حویلی میں ڈال رکھا تھا۔"

"ڈال رکھنے کا مطلب ہے اسے داشتہ بنا کر رکھا تھا۔"

"میں نہیں جانتی۔ چچا کہتے تھے وہ اسے لاہور سے باقاعدہ نکاح پڑھوا کر لائے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہو، صغریٰ حویلی میں پیدا ہوئی۔ اس کی ماں دس برس بعد مر گئی۔ ہم میں سے کوئی صغریٰ کو منہ نہیں لگاتا تھا۔"

جواد نے تائید میں سرہلا کر کہا "درست ہے غلاظت کو کون منہ لگاتا ہے۔"

"چچا نے جب یہ دیکھا تو اپنی تمام جائداد صغریٰ کے نام لکھ دی۔ وصیت میں یہ لکھا کہ صغریٰ بیاہ کر خاندان سے باہر جائے گی تو قانون کے مطابق اسے جائداد سے ایک مقررہ حصہ ملے گا۔ باقی جائداد حکومت کی تحویل میں جائے گی اور اگر اپنے ہی خاندان کا لڑکا اکبر علی صغریٰ سے شادی کرے گا تو تمام جائداد خاندان ہی میں رہے گی۔"

"تمہارے چچا بہت چالاک تھے۔"

"ہم بھی احمق نہیں ہیں۔ میرے بھائی نے شادی کرکے زمینوں کو خاندان سے باہر نہیں جانے دیا اور ہم نے صغریٰ کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ بھلا کیا منہ لے کر دنیا کو بتائیں کہ اس کی ماں کہاں سے آئی تھی۔"

"ہاں اس حکمت عملی سے چچا کی زمینیں اپنی ہوگئیں۔ زمین داری میں ایسے ہی داؤ پیچ سے جاگیر بڑھائی جاتی ہے۔"

وہ منگلا ڈیم کے دفتر تک پہنچ گئے۔ ایک چپراسی نے آکر سلام کیا پھر سلمیٰ کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ باہر آئی جواد کے ساتھ برآمدے سے گزرنے لگی۔ وہاں کام کرنے والے مزدور اور دیگر ملازمین سلام کر رہے تھے' سلمیٰ نے اتنے سلام کرنے والے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ میکے والی جاگیر میں باپ اور بھائی کو سلام کرنے والے کسان اور ملازمین ہوا کرتے تھے لیکن یہ سب کچھ شوہر کے ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ایک ملکہ کی شان سے سر اٹھائے بے نیازی سے سلام کا جواب دیے بغیر دفتر کے اندر آئی۔ جواد نے چھوٹے بڑے افسروں سے اس کا تعارف کرایا۔ سب نے خوش ہوکر اسے خوش آمدید کہا۔ ایک افسر نے جواد کو کچھ اشارہ کیا وہ بولا "یس سر! مجھے یاد ہے میں معاملہ ٹھیک کرلوں گا۔"

پھر وہ بیوی سے بولا "سلمیٰ رانی! یہاں بیٹھو۔ ان سے باتیں کرو میں ایک کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں۔" ایک افسر نے کہا "تم فکر نہ کرو یہ ہماری بھابی ہیں بھابی حکم کریں ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

وہ چلا گیا۔ سلمیٰ چائے کی فرمائش کرکے اپنے میاں کو دیکھ رہی تھی' وہ ساتھ والی کیبن میں گیا تھا۔ شیشے کے آرپار کیبن کے اندر دو چودھری قسم کے بندے اونچے شملے کی پگڑیاں پہنے بیٹھے تھے' جواد کو دیکھتے ہی اٹھ گئے تھے اور جھک کر سلام کر رہے تھے۔ جواد ایک حاکم کی شان سے ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔

سلمیٰ کو عجیب سا لگ رہا تھا مگر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ پہلی بار میاں جی حضور کو رعب اور دبدبے سے بھرپور دیکھ رہی تھی۔ وہ چودھریوں کے سامنے حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ کیبن کے باہر آواز نہیں آرہی تھی تاہم اس کے انداز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑے بڑے جاگیرداروں کو حقارت سے ڈانٹ رہا ہے' جھڑک رہا ہے اور ان کی کسی بات سے انکار کر رہا ہے۔

وہ بڑی بڑی پگڑیوں والے خوشامدانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ جواد تھوڑی دیر تک

ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر ریوالونگ چیئر سے اٹھ گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا شیشے کے پاس آیا۔ شیشے کے اطراف پردے تھے' اس نے پردے کھینچ کر برابر کردیے۔ یوں کیبن کا اندرونی منظر چھپ گیا وہاں کے تمام کردار گم ہوگئے۔ اسرار پیدا ہوگیا کہ پتا نہیں اندر کیا ہورہا ہے؟

وہ دوسرے افسران سے باتیں کرنے لگی مگر دھیان اپنے میاں کی طرف لگا رہا۔ وہ بہت ہی پراسرار جہاں پناہ لگ رہا تھا جو پردے کے پیچھے زمینداروں کو کسی طرح کی پناہ دے رہا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کے چہرے پر افسرانہ شان اور دبدبہ تھا۔ بیوی کو دیکھتے ہی دبدبہ دب دب گیا۔ فوراً ہی مسکرا کر بولا "سوری سلمیٰ رانی! میں ذرا مصروف ہوگیا تھا۔ آؤ میں تمہیں ڈیم دکھالاؤں۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ دفتر سے باہر آکر بولی "آپ میرا اتنا خیال نہ کریں۔ اپنی ڈیوٹی کریں۔"

"وہ بھی ہو رہی ہے مگر تمہارے ساتھ مزہ آرہا ہے۔ سرکار سے یہ بل پاس کرانا چاہیے کہ افسران کے ساتھ ان کی بیگمات بھی دفتر آیا کریں تاکہ صاحبان کا موڈ ٹھیک رہا کرے اور پورے فارم میں رہ کر فرائض ادا کیا کریں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی "پھر رفتہ رفتہ بیڈ روم اٹھ کر دفتر میں آجائے گا۔"

وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے ڈیم کی حد بندی کے پاس آئے۔ ایک ریلنگ سے لگ کر شور مچاتے ہوئے پانی کی تیزی اور تندی کو دیکھنے لگے۔ وہ ریلنگ کو چھوڑ کر جواد کو مضبوطی سے پکڑ کر بولی "مجھے ڈر لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی اپنی قوت سے مجھے کھینچ رہا ہے اور میں کھنچتی ہوئی جاؤں گی پھر وہاں غرق ہوجاؤں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "جہاں موت نظر آتی ہے' وہاں تمہاری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی حیات بخش بھی ہے اور حیات کش بھی۔ اسی لیے ڈیم بنائے جاتے ہیں تاکہ یہ پانی ہی رہے' سیلاب بلا نہ بنے اور تمام کھیتوں کو اور تمام صوبوں کو پانی منصفانہ تقسیم سے پہنچتا رہے۔"

وہ جواد کو بدستور مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے دور لے آئی۔ وہ کہہ رہا تھا "تم جس پانی کی تیزی سے ڈر رہی ہو اس سے بجلی پیدا ہو رہی ہے اور ہمارے گھروں تک جارہی ہے۔"

"توبہ ہے۔ بجلی بھی شاک پہنچاتی ہے اور ہلاک کرتی ہے۔"

"دنیا کی ہر چیز نقصان پہنچاتی ہے' ایک معمولی سی چیونٹی بھی کاٹنے سے باز نہیں آتی لیکن انسان کی عقل ہر نقصان کے پیٹ سے فائدہ نکالتی ہے۔"

اس نے پوچھا "اور یہ انسانی عقل چیونٹی سے کیا فائدہ حاصل کرتی ہے؟"

"ہم نے چیونٹیوں سے قطار بنانا اور خوراک ذخیرہ کرنا سیکھا ہے۔ ہم ایسے ڈیموں میں

پانی ذخیرہ کرتے ہیں۔ پھر پانی کی قلت کے وقت اسے مختلف نہروں کے ذریعے پورے ملک کے کھیتوں تک پہنچاتے ہیں۔"

دفتر کے سامنے خوب صورت سا باغیچہ تھا۔ نگاہوں میں تازگی بھرنے والی ہریالی اور رنگ برنگے پھول تھے۔ وہ کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ سلمٰی نے پوچھا۔ "کیا پردے میں رہ کر کام کیا جاتا ہے؟"

"میں نہیں سمجھا کیسا پردہ؟"

"آپ نے کیبن میں زمینداروں سے گفتگو کرنے کے دوران شیشوں پر پردہ چڑھادیا تھا۔ آخر وہاں کیا ہو رہا تھا۔؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "تمام سرکاری شعبوں میں کچھ ڈیوٹیاں پردوں کے پیچھے ہوتی ہیں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں جو رقمیں جمع ہو رہی ہیں، وہ اسی پردے کے پیچھے سے آتی ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی "میں سمجھ گئی تھی مگر سوچ رہی تھی دوسرے افسران اس معاملے سے دور کیوں ہیں، کیا وہ حاجی نمازی ہیں؟"

اس نے زور کا قہقہہ لگایا پھر کہا "ایسی بات نہیں ہے زمینداروں سے میں ہی معاملات طے کرتا ہوں حصہ سب کو پہنچ جاتا ہے۔"

"کیا انہوں نے بھی رقم دی ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا یہاں رقم لے کر پھنسنا ہے؟ تم دیکھ رہی ہو ادھر فوجی جوان اور افسران کتنے چوکس رہتے ہیں۔ ان کے کانوں میں لین دین کی بھنک پڑے گی تو ہم اندر ہوجائیں گے۔ ہم یہی تاثر دیتے ہیں کہ مختلف علاقوں کے زمیندار اور ٹھیکیدار پانی اور ریت کے حصول کے لیے درخواستیں لے کر آتے ہیں۔"

"وہ دونوں کیوں آئے تھے؟"

"ان میں سے ایک ٹھیکیدار تھا۔ اس نے ٹرکوں میں ریت بھر کر لے جانے کا ٹھیکہ حکومت سے لیا ہے۔ اسے معلوم کرنا پڑتا ہے کہ ہم یہاں سے کتنی مقدار میں پانی چھوڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پانی زیادہ چلے اور ریت بھرنے والے ٹرک اسی میں بہہ جائیں۔ وہ ہمیں کمیشن دیتا ہے، ہم ادھر پانی نہیں چھوڑتے۔"

"اور وہ دوسرا زمیندار کیا چاہتا تھا؟"

"قصہ یہ ہے کہ پچھلے سال یعنی مارچ ء میں چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزرائے آبپاشی اور ان کے ماہرین نے متفقہ طور پر یہ معاہدہ کیا تھا کہ چاروں صوبوں میں پانی کی تقسیم منصفانہ ہوگی۔ بیشتر کینال میں پانی چھوڑنے کی مقدار مقرر کردی گئی۔ یہ زمیندار ہمیں کہنے آیا تھا کہ جلال پور کینال میں کیوسک پانی چھوڑنے کا حکم تھا لیکن ہم حکم کی تعمیل نہیں کر رہے ہیں؟"

سلمٰی نے پوچھا "کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

"پانی کا ذخیرہ نہیں ہے۔"

"یہ جو آنکھوں کے سامنے اتنا پانی ہے؟"

"کوئی حکمران اور معائنہ کرنے والی ٹیم آنکھوں سے یہاں دیکھنے نہیں آتی۔ پانی کا یہ ذخیرہ ہمارے بینک بیلنس کے لیے ہے' وہ زمیندار خوش ہوکر گیا ہے اور ہمیں بھی خوش کرگیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی، پھر بولی "اصل بات تو رہ گئی۔"

"کون سی بات؟"

"وہی میرے بھائی کی شادی کا مسئلہ۔"

"میں اس مسئلے میں کیا کہہ سکتا ہوں تم بہتر سمجھتی ہو۔"

"آپ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔ میں اپنے میکے والوں سے کہتی رہتی ہوں کہ آپ بے حد ذہین ہیں، پیچیدہ معاملات کو بڑی ذہانت سے سلجھا دیتے ہیں۔"

وہ خوش ہوکر بولا "ٹھیک ہے اکبر کا مسئلہ کیا ہے؟"

"یہی کہ اس کی زندگی میں ایک آئیڈیل بیوی نہیں ہے کیا وہ صغریٰ کو فخر سے بیوی کے طور پر دوست احباب کے سامنے لا سکتا ہے؟"

"نہیں۔ یہ اکبر کی بدقسمتی ہے۔"

"یہ بدقسمتی دوسری بیوی دور کرسکتی ہے۔ جس طرح آپ فخر سے مجھے ہر محفل اور تقریب میں لے جاتے ہیں۔ اکبر بھی ایک شریک حیات کے ساتھ یہ فخر حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"ضرور۔ یہ میرے سالے کا حق ہے۔"

"آپ میرے بھائی کو گالی دے رہے ہیں۔"

"کیسی بات کر رہی ہو۔ یہ گالی نہیں، رشتہ ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "یہ اگر گالی بھی ہے تو برا ماننے والی نہیں ہے۔ پھر ایک بار میرے بھائی کو سالا بولیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "سالا میرا سالا اکبر سالا۔"

"میرا بھائی بھی آپ کو سالا کہنا چاہتا ہے۔"

"آں؟" جواد کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اس نے سنجیدگی سے اور سوالیہ نظروں سے سلمٰی رانی کو دیکھا، پھر پوچھا "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"فیروزہ کو اپنی بھابی بنانا چاہتی ہوں۔"

"ہوش میں تو ہو؟"

"کیا میں ہوش مند نہیں، پاگل نظر آرہی ہوں؟ کیا آپ کو اور فیروزہ کو پتھر مار رہی

ہوں؟"

"تم ہوشمند ہو لیکن میری بہن کی بھلائی نہیں سوچ رہی ہو۔ اسے ایک عورت کی سوکن بنانا چاہتی ہو۔"

"ہمارے خاندان میں اور اکبر کی نظروں میں پہلی نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"مگر اس کا وجود ہے تم لوگ اس کی اہمیت سے انکار کرسکتے ہو' اس کے وجود کو صفر نہیں بنا سکتے۔ اس کا نمبرون ہے وہ ہر حال میں ون رہے گی۔ تم میری بہن کو نمبر ٹو بنانے کا احمقانہ خیال دل سے نکال دو۔"

وہ ناراض ہو کر' کرسی پر پہلو بدل کر اور منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کے تیور بدلنے سے عاشق میاں نے پریشان ہوکر وائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کام کرنے والے کافی فاصلوں پر تھے۔ شاید کسی نے صاحب کی بیگم صاحبہ کو ناراض ہوتے اور منہ پھیرتے نہیں دیکھا۔ دیکھے جانے سے پہلے اسے منا لینا لازمی تھا۔ وہ خوشامدانہ انداز میں بولا "پلیز سیدھی ہوکر بیٹھو لوگ کیا سوچیں گے۔"

"میں نہیں جانتی کیا سوچیں گے یہ آپ سوچیں۔"

"دیکھو میں تمہاری ہر بات آمنا صدقنا مان لیتا ہوں لیکن یہ میرا نہیں میرے پورے خاندان کا معاملہ ہے۔"

"اور اس خاندان میں آپ ہی ایک بیٹے ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں ہے امی ابا آپ پر جان دیتے ہیں۔ آپ کی ہر بات مانتے ہیں ہر خواہش پوری کرتے۔ کیا یہ ایک بات نہیں مانیں گے؟"

"میں نے کبھی کوئی نامعقول بات نہیں منوائی۔ ایک بات اٹل ہے ہمارے خاندان میں وٹہ سٹہ نہیں چلتا۔ جس گھر سے لڑکی لاتے ہیں اس گھر میں اپنی لڑکی نہیں دیتے۔ اس سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔"

"ایسے کیا مسائل پیدا ہوجائیں گے کچھ میں بھی تو سنوں؟"

"یہ مجھ سے نہیں ابا جان سے جاکر پوچھو' میں فیروزہ کا بھائی ہوں' وہ باپ ہیں۔ فیصلہ ان کی مرضی سے ہوگا۔"

وہ پھر منہ گھما کر بیٹھ گئی۔ وہ پریشان ہوکر بولا کیا مشکل ہے۔ دیکھو چپراسی آرہا ہے' مسکرا کر باتیں کرو۔"

چپراسی نے قریب آکر کہا "جناب! کھانا لگ رہا ہے' صاحب لوگ آپ کو اور بیگم صاحبہ کو بلا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ہم آرہے ہیں۔"

وہ پتھر مارنے کے انداز میں بولی میں نہیں کھاؤں گی' مجھے بھوک نہیں ہے۔

چپراسی نے جواد کا منہ دیکھا۔ وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا "بیگم صاحبہ کے سر

میں درد ہے ہم بعد میں کھالیں گے' صاحب لوگوں سے کہو وہ لنچ کریں۔"

چپراسی چلا گیا جواد نے دبی زبان سے کہا "کیا تمام افسروں کے سامنے میری انسلٹ کروگی؟"

"اور آپ جو میرے پورے میکے میں مجھے ذلیل کرنے والے ہیں؟"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ فیروزہ کے معاملے میں امی ابا جان مختار کل ہیں۔"

"میں اور آپ اکبر کی حمایت میں بولیں گے اور فیروزہ بھی راضی رہے گی ابا جان کے فیصلے کمزور پڑجائیں گے۔"

"اچھی بات ہے' سوچوں گا۔ پہلے دفتر میں چل کر روٹی کھاؤ ورنہ یہ ساتھی افسران ہمارے متعلق طرح طرح کی رائے قائم کریں گے۔"

وہ بڑے اعتماد سے کھانے کے لیے اٹھ گئی۔ میاں جی کو پہلے مرحلے میں تھوڑا جھکا لیا تھا۔ باقی شب خون مار کر میدان مار سکتی تھی۔

چودھری اکبر علی نے فون پر فیروزہ سے پیار بھری التجا کی تھی کہ وہ گھر سے باہر آکر کہیں ملاقات کرے۔ جو باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں وہ روبرو ہوجائیں گی لیکن فیروزہ نے ہاں یا نہ میں جواب نہیں دیا تھا فون کا رابطہ منقطع کردیا تھا۔

تب سے اکبر علی کے بے قراری بڑھ گئی تھی۔ فیروزہ کی بے نیازی پر غصہ بھی آرہا تھا۔

وہ اپنی جاگیر میں جسے چاہتا تھا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔ جہلم، پنڈی، اسلام آباد اور لاہور میں جانے کتنی ہی چاہنے والیاں تھیں۔ قدرت نے اسے ایسے زبردست مردانہ حسن سے نوازا تھا کہ لڑکیاں لیموں کاٹتے وقت اسے دیکھتے دیکھتے اپنی انگلیاں کاٹ لیتی تھیں۔ گویا حسنِ یوسف" نصیب ہوا تھا۔ ایک فیروزہ تھی جو سحر زدہ نہیں ہو رہی تھی اور اگر ہو رہی تھی تو اوروں کی طرح بے لگام نہیں ہو رہی تھی۔ عورت کی آبرو اور انا کے حوالے سے محتاط رہنے کی عادی تھی۔

چودھری اکبر علی کو صبر کرنا نہیں آتا تھا۔ بچپن سے ہر ضد فوراً" پوری کردی جاتی تھی۔ جوانی کے پہلے دن سے اس بیمار کو ہر علاقے کا انار مل جاتا تھا۔ وہی ایک جہلمی انار حلق میں اٹک گیا تھا۔ اسے اگلنا نہیں چاہتا تھا اور وہ نگلنے میں نہیں آرہی تھی۔ چونکہ نگل لینے کی ضد تھی اس لیے شادی کے لیے بھی آمادہ ہوگیا تھا۔ ورنہ گلے میں ڈھول لٹکائے رکھنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

پھر یہ کہ فیروزہ کسی ایسے ویسے گھرانے سے نہیں تھی خاندانی لڑکی تھی۔ اپنی بیوی صغریٰ کو چھپا کر، پہلی شادی کو راز میں رکھ کر فیروزہ کو دلہن نہیں بنا سکتا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا اس لیے بھی نہیں دے سکتا تھا کہ سلمیٰ آپا اس خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

پھر جب فیروزہ کو پہلی شادی کی روداد معلوم ہوئی تو وہ غصے سے انگارہ ہوگئی۔ اونچی اڑان والی پتنگ کی طرح کٹ کر ہاتھ سے نکل گئی۔ اب وہ فضا میں ڈول رہی تھی۔ وہ اسے لوٹنے کے لیے لپک رہا تھا۔ اچک رہا تھا اور وہ ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

اس نے شام کو فون پر سلمیٰ سے پوچھا "فیروزہ کچھ کہہ رہی ہے میرے بارے میں؟"

"کچھ نہیں۔ اب وہ میرے کمرے میں بھی نہیں آتی ہے۔ جب تک اسے تمہاری

شادی کا علم نہیں ہوا تھا وہ دن رات میرے پاس گھسی رہتی تھی اور تمہارے بارے میں خوب باتیں کیا کرتی تھی۔"

"آپا! کسی طرح وہی دن واپس لے آؤ۔"

"کیسے لے آؤں؟"

"میں تمہارے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہوں اور تم میرا اتنا سا کام نہیں کرسکتیں۔"

"کیوں جھوٹے دعوے کرتے ہو تم نے کون سی قربانی دی ہے؟"

"تمہاری عمر پچیس برس کہنے کے لیے خود کو چوبیس برس کا نوجوان ظاہر کرتا ہوں۔"

وہ ڈانٹ کر بولی "بکواس مت کرو" کیا ایسی باتیں فون پر کی جاتی ہیں۔"

عمریاد آنے سے مستی میں ناچتی ہوئی مورنی کو اپنے بھدّے پاؤں نظر آجاتے تھے۔ رشتے کے انتظار میں چونتیس برس کی ہوگئی تھی۔ تب جواد جیسا گدھا سواری کے لیے ملا تھا۔ نکاح پڑھاتے وقت اس کی عمر پچیس برس لکھوائی گئی تھی جبکہ وہ میاں سے چھ برس بڑی تھی۔

ساس کو بہو پسند نہیں تھی۔ وہ بیٹے کی پسند کو برداشت کر رہی تھی سسر نے بھی شادی سے پہلے سلمیٰ کو دیکھا اور سمجھا تھا لیکن زبان سے نہیں کہا کہ وہ کچھ عمر والی لگتی ہے۔ بہو اپنے ساتھ پچیس لاکھ روپے اور اپنے حصے کی کچھ زمینیں لے کر آئی تھی۔ پھر جواد اس کا دیوانہ تھا۔ اس لیے ہر طرح سے اس کی پوزیشن موجود تھی۔ اس کے باوجود کوئی عمر کا حساب کرے تو اسے غصہ آجاتا تھا۔

وہ بولی "اکبر! کام کی باتیں کرو۔ جب وہ تمہارا نام نہیں سننا چاہتی ہے تو میں اسے تمہاری طرف کیسے مائل کروں؟"

"تم چاہو تو ہمارے ملاقات کراسکتی ہو۔"

"کیا مجھے سسرال سے نکلواؤ گے؟"

"تم پر کوئی بات نہیں آئے گی۔ ہماری ملاقات کے لیے دور ہی دور رہ کر راستہ ہموار کرسکتی ہو۔"

"تم تو پیچھے پڑگئے ہو۔ فیروزہ جیسی ہزاروں لاکھوں مل جاتی ہیں۔"

"لاکھوں ملتی رہیں گی۔ پھر بھی دل اسے مانگتا رہے گا۔"

"توبہ ہے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"فیروزہ کے امتحانات کب ختم ہورہے ہیں؟"

"ختم ہوچکے ہیں۔ کل اس نے آخری پرچہ دیا تھا۔ اب رزلٹ آنے تک گھر میں رہے گی۔ نہ باہر جائے گی نہ کسی بہانے تم سے ملاقات ہوسکے گی۔"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ گھر سے باہر نہ جائے۔ اس کا باپ یعنی تمہارا سسر صبح نو بجے گھر سے چلا جاتا ہے۔ صرف تمہاری ساس ایک دیوار ہے۔ اسے کسی طرح دو چار گھنٹے

کے لیے کسی رشتے دار کے ہاں بھیج سکو تو میرا کام بن جائے گا۔"

"امی کہیں جائیں گی تو فیروزہ کو ساتھ لے جائیں گی۔"

"ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ گھر میں تنہا رہ جائے۔"

"تدبیر کے باوجود تنہا نہیں ہوگی کیونکہ میں یہاں رہوں گی اور میں نہیں چاہوں گی کہ میری موجودگی میں تم دونوں کی ملاقات ہو اور بات بگڑے تو سارا الزام مجھ پر آئے۔"

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا "آپا! تم جانتی ہو نا؟ ابھی جو ہنڈا ایکارڈ میرے پاس ہے وہ بارہ لاکھ روپے کی ہے۔ اگلے دو مہینوں میں جو کار خرید رہا ہوں اس کی قیمت بیس لاکھ روپے ہے۔ میں بارہ لاکھ کی موجودہ کار فروخت نہیں کروں گا۔ یہ تمہیں دے دوں گا۔"

سلمیٰ نے خوش ہو کر ایک گہری سانس کھینچی پھر پوچھا "کیا سچ کہہ رہے ہو؟"

"کیا جھوٹ سمجھ رہی ہو؟ کیا میں نے تمہاری شادی میں تین لاکھ کا ہیروں کا سیٹ نہیں دیا تھا۔ جس دن فیروزہ سے میرے نکاح کی تاریخ طے ہوگی اسی دن وہ کار تمہاری ہو جائے گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اکبر نے پوچھا "کیا میری آفر بجھ رہی ہو؟"

"ہاں تم نے تو مجھے بارہ لاکھ کی سولی پر چڑھا دیا ہے۔ میری سانسیں رک رہی ہیں۔ میں کوئی تدبیر سوچتی ہوں۔"

"جلدی سوچو' جتنی جلدی وہ میری ہوگی اتنی ہی جلدی کار تمہاری ہو جائے گی۔"

"کل صبح آؤ میں کچھ نہ کچھ کروں گی۔ اصل مسئلہ تو فیروزہ کو راضی کرنا ہے۔ وہ ہوئی راضی تو پھر جیت لی بازی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کے اندر کھلبلی سی ہو رہی تھی وہ جیسے نیلام گھر میں پہنچ گئی تھی۔ بھائی کی ایک بولی پر نند کو اس کے حوالے کر کے بارہ لاکھ کی کار جیت سکتی تھی۔ کار دسترس میں تھی اور نند گھر میں۔ صرف دو گام چلتی اور منزلِ مراد سامنے آجاتی۔

وہ سوچتے سوچتے فیروزہ کے پاس آئی۔ پہلے تو اسی لڑکی کو سبز باغ دکھانا تھا اور شیشے میں اتارنا تھا۔ وہ ایک صوفہ پر بیٹھی وی سی آر کے ذریعے فلم دیکھ رہی تھی۔ سلمیٰ نے اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کون سی فلم ہے؟"

وہ فلم کے دلچسپ سین پر نظریں جمائے ہوئے بولی "دل ہے کہ مانتا نہیں۔"

"تمہارا دل کب مانے گا فیروزہ؟"

اس نے چونک کر بھابی کو دیکھا۔ پھر انجان بنتے ہوئے کہا "بھابی! میں فلم کا نام بتا رہی ہوں۔"

سلمیٰ نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا "یہ فلم تم میرے ساتھ پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ تم اسے دوبارہ اس لیے دیکھ رہی ہو کہ اس فلم کی ہیروئن تمہارے مزاج کے مطابق ہے۔ ہیرو اسے راضی کرتا ہے اور وہ راضی نہیں ہوتی لیکن دل ہی دل

میں ہیرو سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔"

"میں آپ کے بھائی سے متاثر نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ میرے جانے کے بعد اس فلم کو اور غور سے دیکھنا۔ فلم کی ہیروئن پوجا آخر تک زبان سے انکار کرتی رہتی ہے لیکن اس کا دل انکار کو نہیں مانتا۔ آخر جب دل نہیں مانتا ہے اور محبت مجبور کرتی ہے تو وہ عامر خان کے بازوؤں میں چلی آتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں تمہارا دل کب مانے گا؟ جب میرا بھائی اپنی جان دے دے گا؟"

"کوئی کسی کے لیے جان نہیں دیتا۔ جان دینے والے مجنوں رانجھا اور مہینوال وغیرہ سب کنوارے تھے۔ آج تک کسی شادی شدہ مجنوں نے کسی کنواری پر جان نہیں دی۔ صرف ہوس پوری کی ہے سیدھی سی بات ہے جو مجنوں ہوگا وہ کنوارا ہوگا۔ جو شادی شدہ ہوگا وہ مجنوں نہیں ہوگا۔"

"توبہ ہے سلائی مشین کی طرح بولتی چلی جاتی ہو۔ کیا جس کی شادی ہو جاتی ہے اس کا دل مر جاتا ہے؟ کیا اس کا دل پیار کے لیے نہیں دھڑکتا؟ تم اس حقیقت کو سمجھتی ہو کہ اکبر کو پہلے ہی آئیڈیل بیوی مل جاتی یا پہلے تم اس کی زندگی میں آجاتیں تو آج وہ یوں عاشق مزاج نہ ہوتا۔ تمہارے ساتھ بہترین ازدواجی زندگی گزار رہا ہوتا۔"

فیروزہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اکبر عاشق کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی گزرتے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں میں نہ جانے اس کے ساتھ کتنے موسم گزار لیے۔ بھابی کی آواز پر چونک گئی وہ کہہ رہی تھی "میں جانتی ہوں تو میرے ویر کو سوچ رہی ہے۔"

وہ "اونہہ" کے انداز میں سر جھٹک کر بولی "جی نہیں میرے پاس سوچنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔"

سلمیٰ نے بڑے درد بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا "تو اسے نہ ملی تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ جیسے تیرا بھائی اس خاندان میں ایک ہی بیٹا ہے۔ ویسے ہی اکبر ہمارے خاندان کا واحد چشم و چراغ ہے۔ میں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں' صغریٰ تیری ازدواجی زندگی میں آہٹ بن کر بھی نہیں آئے گی۔ تیرے جتنے مطالبات ہیں وہ شادی سے پہلے پورے کر دیے جائیں گے اور تیرے دل میں جو ہے' اسے اگل دے۔ مجھے صرف بھابی نہیں سہیلی سمجھ کر کچھ نہ چھپا۔"

وہ ایک دم سے گھوم کر سلمیٰ سے لپٹ گئی۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسے ماں اور بھابی کی نہیں ایک سہیلی کی ضرورت تھی۔ پانی کا ریلا ہو یا جذبات کا اگر اس کی نکاسی کا راستہ نہ ہو تو یہ بند توڑ کے نکل جاتا ہے۔ بند کا ٹوٹنا نقصان پہنچاتا ہے۔ فیروزہ کا دل اس گھبرو کو مانگتا تھا۔ صحیح راستے سے نہ ملے تو غلط راستے سے مانگتا تھا۔ وہ بے چینی سے سوچتی تھی کہ اپنے اندر کی بات کسے بتائے؟ کس طرح غبار نکالے؟ باتوں سے

پیٹ پھولے تو ایک دن بھی انتظار کا یارا نہیں ہوتا۔ سلمٰی اس کی یار بن گئی تو اس سے یوں لپٹ گئی جیسے اس کے بھائی سے لپٹ رہی ہو پھر بے اختیار بولنے لگی۔

او ظالما! میں ٹوٹ گئی۔

میں سوچتی تھی' تو باسی ہوگیا ہے میں اپنی تازگی کو تجھ سے دور رکھوں۔

تجھے دور سے دیکھوں اور دور سے محبت کروں۔ پاس آکر تجھے چھونے کی کوشش غلطی کروں گی تو تو ضرورت بن جائے گا۔

ہائے مگر انکشاف ہو رہا ہے کہ تیری ضرورت لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہی ہے اور زہر بن کر میرے بدن میں پھیل رہی ہے۔ عجیب بندہ ہے باہر رہ کر اندر کرامات دکھا رہا ہے۔

سلمٰی سن رہی تھی۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس کی پشت کو سہلا رہی تھی۔ پھر اس نے کہا "یہ اچھا کیا کہ مجھے رازدار بنالیا۔ آج سے تو میرے بھائی کی ہے۔"

وہ چونک گئی جیسے نیند میں اکبر کے وجود سے لگ رہی تھی۔ اب خیال آیا بھابی سہیلی سے لگی ہے اور جانے کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ جنوں میں بولتی رہی ورنہ کبھی نہ بول پاتی۔

سلمٰی کی اب کسی شک و شبے کے بغیر بارہ لاکھ کی لاٹری نکل آئی تھی۔ اس نے کہا "میرا بھائی تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا میں اسے کل آنے کے لیے کہوں؟"

کل میں امی کے ساتھ پنڈی جاؤں گی وہاں خالہ جان بہت بیمار ہیں۔"

"وہ خالہ جان کی عیادت کو چلی جائیں گی تو کسی بہانے رک جا۔"

"میں کیا بہانہ کروں؟"

"ہزار حیلے بہانے ہوسکتے ہیں۔ عورت کی تکلیف عورت ہی سمجھتی ہے بس ایسی ہی کوئی بیماری یا تکلیف بتا دینا۔"

پھر اس نے اپنا منہ کان کے پاس لاکر رازداری سے کچھ کہا فیروزہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے یہی بہانہ کروں گی۔"

سلمٰی نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم نے جی خوش کردیا ہے۔ میں ابھی اکبر سے بات کرتی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی پھر ٹیلیفون کے پاس بیٹھ کر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہوگیا۔ ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "اکبر سے کہو میں سلمٰی بول رہی ہوں۔"

وہ انتظار کرنے لگی پھر اکبر کی آواز آئی "ہیلو آپا! خیریت؟"

"خیریت بھی ہے اور خوش خبری بھی۔"

"کیا واقعی؟"

"پہلے بتاؤ میرے انعام کا کیا ہوگا؟"

"میں جو وعدہ کرتا ہوں پورا کرتا ہوں دو ماہ کے اندر میری نئی کار آرہی ہے۔ یہ ہنڈا ایکارڈ تمہیں دے دوں گا۔"

"میں نے فیروزہ سے اس کے دل کی بات اگلوا لی ہے وہ تو تم پر بری طرح مرتی ہے۔ اوپر سے نخرے دکھا رہی تھی۔ میں نے ایسا منتر پھونکا کہ وہ تم سے ملنے کے لیے راضی ہوگئی ہے۔"

"تم نے تو کمال کردیا ہے آپا! ملاقات کب ہوگی؟"

"کل صبح امی پنڈی جارہی ہیں۔ ابا ٹھیک نو بجے شوروم چلے جاتے ہیں' اگر تم ایک دن کے لیے اپنی کار مجھے دے دو تو میں جواد کے ساتھ منگلا چلی جاؤں گی۔"

"کیا کام دکھا رہی ہو آپا! میں ابھی رات دس بجے تک کار تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔"

پھر یہی ہوا وہ رات ہی کو کار چھوڑ گیا۔ سلمٰی جواد کے ساتھ پروگرام بناکر منگلا چلی گئی۔ چودھری عنایت حسین اپنے وقت پر شو روم چلے گئے ... ان کی بیگم صبح سات بجے ہی پنڈی جاچکی تھیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ بہو ان کے بیٹے کے ساتھ منگلا جانے والی ہے تو شاید وہ بیمار بہن کے پاس پنڈی نہ جاتیں لیکن بہو نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ گھر میں فیروزہ کے ساتھ رہے گی۔

صبح دس بجے تک سب چلے گئے ماسی گھر کی صفائی اور تالا لگا کر رخصت ہوگئی۔ اکبر سے ملاقات کا خیال ایسا تھا کہ سوچ سوچ کر دل دھڑک رہا تھا۔ وہ آپ ہی آپ شرماتی رہتی تھی اور بھابی وغیرہ سے چھپ چھپ کر مسکراتی رہی تھی لیکن جب گھر میں کوئی نہ رہا بالکل تنہا رہ گئی تو اسے بے امانی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرانے لگی ایسی سازشی تنہائی میں اکبر آئے گا تو کیا ہوگا؟

سلمٰی نے کہا تھا "گھبراتی کیوں ہو میں کار میں بازار تک جا رہی ہوں۔ تمہارے بھائی جان مجھے یہاں واپس چھوڑ کر منگلا جائیں گے' میں آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی۔"

بس اسی تسلی نے دل کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ محبوب سے ملنے کے خیال سے جو دل مسرت سے دھڑک رہا تھا اسے دھڑکا لگ گیا تھا۔ ادھر جواد نے روانگی کے وقت کہا تھا گھر میں کوئی نہیں ہے۔تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو' فیروزہ اکیلی رہ جائے گی۔

"تو کیا ہوا۔ وہ ننھی بچی نہیں ہے۔ پھر اپنے گھر کی چار دیواری میں ہے' کیا اسے شیر ٹھاکر لے جائے گا۔"

"نہیں میں تو صرف ابا جان کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ وہ ناراض ہوں گے کہ بہو یک جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر کیوں گئی ہے۔"

"میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے کہ ہم دس میل دور منگلا جا رہے ہیں۔ آپ فکر نہ

کریں میں ابا جان سے نمٹ لوں گی۔"

وہ قائل ہو کر بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ بعض بہویں اور بھابیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے بہو کاٹے رشتوں کا لہو اور بھابی نند کی خرابی اس کہاوت کو سلمٰی سچ کر رہی تھی۔

کال بیل کی آواز پر فیروزہ تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ بھابی نے آدھے گھنٹے میں آنے کو کہا تھا اور ٹھیک آدھا گھنٹہ گزرا تھا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دروازے کے فریم میں محبوب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پر سنبھالتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ وہ اندر آکر بولا "کیا اب بھی منہ پھیروگی؟"

"وہ وہ بھابی اور بھیا آتے ہوں گے۔"

اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھاتے ہوئے کہا "وہ نہیں آئیں گے دونوں منگلا گئے ہیں۔"

وہ ذرا دور ہو کر بولی "بھابی نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ ابھی آجائیں گی۔"

"آپا یہ نہ کہتیں تو تم یہاں اکیلی نہ رہتیں۔"

یہ سنتے ہی دل گھبرانے لگا۔ اتنے بڑے مکان میں اس کے ساتھ تنہا تھی جسے یاد کرکے تصورات کی تنہائیاں دور کرتی تھی۔ صحیح حالات معلوم ہوتے ہی اس کے اندر گرم ہوا چلنے لگی۔ اب اس کی طرف نظر اٹھانے کے خیال سے ہی بدن لرز رہا تھا۔ اس کپکپاہٹ میں خوف نہیں تھا تشویش تھی اور تجسس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

وہ دوسری طرف گھوم کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گھوم کر سامنے آگیا اس نے کترا کر جانا چاہا وہ راستہ روک کر بولا "کیوں شرماتی ہو میں غیر نہیں ہوں۔ اپنے دل سے پوچھو اس وقت سارا جہاں بیگانہ ہے اور میں خون کے رشتوں سے بھی زیادہ تمہارا اپنا ہوں۔"

اس کا دل مان رہا تھا اور ساری دنیا کی دولت کے عوض اسے مانگ رہا تھا۔ اس نے چھوٹی سی ایک ڈبیا کھول کر ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی پھر کہا "یہ پہلی ملاقات کا تحفہ ہے اسے قبول کرو۔"

وہ پیار بھرے تحفے سے انکار نہیں کرسکتی تھی لیکن ٹالنا چاہتی تھی۔ ٹالنے کے لیے کچھ کہنا ضروری تھا اور کہنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار کے انداز میں ہلایا۔ چودھری اکبر نے ہاتھ پکڑ لیا۔ کیا پکڑ تھی سارا وجود مٹھی میں چلا گیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنا رہا تھا اور اسے پسینہ آرہا تھا۔ اس خیال سے بھیگ رہی تھی کہ وہ اپنی ملکیت بنا رہا ہے اور اس کی ہاں یا نہ کے بغیر بنا رہا ہے۔

پھر اس نے ایک نیکلس نکالا۔ سونے کے ہار میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ وہ ہار کے دونوں سروں کو تھامے ہوئے اس کی گردن کے قریب لایا وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس

کے ہاتھوں سے پہننے کا مطلب یہ ہوتا کہ پہنانے والا سانسوں کے قریب آجاتا۔ اس نے بڑی محبت اور عاجزی سے کہا "پلیز میرا دل نہ توڑو اپنے ہاتھوں سے پہنانے دو۔"

وہ آگے بڑھا اس بار یہ پیچھے نہ ہٹ سکی۔ پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی وہ بالکل روبرو ہو گیا اس نے ہار پہنانے کے لیے ڈوپٹے کو سر سے ڈھلکایا تو وہ ڈھلکتا ہوا فرش پر چلا گیا۔ اس پر جو گزر رہی تھی اس کے بعد اسے پردے کا ہوش نہ رہا تھا۔ وہ سحرزدہ ہوگئی تھی اور وہ اس پر جھکا ہوا ہار پہنا رہا تھا کہ گرم گرم سانسیں چہرے پر طلسم جگاتی جارہی تھیں۔

ایسے میں دل کیا تھا؟ بے ایمان ہو رہا تھا۔

دماغ کیا تھا؟ احساسات کے ہجوم میں پگلا رہا تھا۔

اور بدن کیا تھا؟ جذبوں کی سان پر چڑھا ہوا تھا۔

سانسیں تھیں کہ دریا کی طرح چڑھ رہی تھیں۔ دریا کی طرح اتر رہی تھیں۔ پیار کرنے والے سو آوارگی میں اتنا چڑھا دیتے ہیں کہ پھر وہاں سے اترنا محال ہوجاتا ہے۔

اسے اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ وہ چڑھتی ہوئی سانسوں میں کہہ رہا تھا۔ "شکریہ تم نے میری پناہ میں آکر مجھے عالم پناہ بنادیا ہے۔"

وہ سستے کے دور میں بنوائی ہوئی پندرہ لاکھ کی مضبوط کوٹھی تھی اب اس کی قیمت تقریباً" چالیس لاکھ روپے ہوگئی تھی۔ اتنی مہنگی کوٹھیاں صرف شان و شوکت کی نمائش کے لیے نہیں بنوائی جاتیں۔ پردہ شرافت اور تہذیب قائم رکھنے کے لیے یہ دبدبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہاں باہر کی گندگی اندر نہیں آتی ہے۔ یہاں سے ٹکرا کر واپس جانے والا گندگی کا سیلاب غریبوں کے کچے مکانوں میں گھستا ہے۔

یہ محض خوش فہمی ہے۔ گندگی کے ریلے کو مضبوط اور قیمتی دیواریں نہیں روک پاتیں۔ اسے تو صرف عورت کی شرم اور مرد کی غیرت روکتی ہے۔ اس کوٹھی میں خاندان کا سربراہ چودھری عنایت حسین تھا۔ وہ جوان بیٹی کی ذمہ داری بیگم کو سونپ کر گیا۔ بیگم اپنی بہو کے بھروسے پر اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہاں ایک غیرت مند بھائی تھا جو بیوی کو خوش کرنے کے لیے کوٹھی کے درودیوار کو بہن کا محافظ بنا کر چلا گیا۔ جانا بھی ضروری تھا۔ بیوی نے گھر کی عزت کو داؤ پر لگا کر بارہ لاکھ کی رشوت لی۔ میاں ڈیم کا پانی بیچ کر حرام کماتا تھا اور جس گھر میں حرام آجاتا ہے وہاں محض دکھاوے کی عزت اور غیرت باقی رہ جاتی ہے۔

کبھی اس بے حیا ملاقات کا راز کھلے گا تو ایک دوسرے سے پوچھا جائے گا کہ یہ سیلاب گھر کے اندر کیسے آیا تھا۔ وطن عزیز کے اہلکاروں کی طرح کوئی اپنے سر پر الزام نہیں لے گا کہ یہ برائیاں اور تباہیاں کہاں سے آتی ہیں؟ بے حسی' غیر ذمہ داری' منافع خوری اور رشوت کے حصول کا ذکر بھی نہیں آئے گا۔ سب اپنا بچاؤ کریں گے اور اسے مقدر کی مرضی اور قدرت کی رضا کہیں گے جبکہ یہ تسلیم شدہ کلیہ ہے کہ عورت کسی مرد کی شرکت اور بے غیرتی کے بغیر بے حیا نہیں بنتی۔ یہ جو گھروں میں سیلاب آتا ہے یہ چند بڑے اہلکاروں کی شرکت اور بے غیرتی سے آتا ہے۔

چودھری عنایت حسین ایک بجے دوپہر کا کھانا کھانے آئے تو بیٹی کو تنہا دیکھ کر حیران ہوئے لیکن اس کی معصومیت اور گھر کے بند دروازے دیکھ کر مطمئن ہوگئے۔ پھر فیروزہ نے جھوٹ کہہ دیا کہ بھابی ابھی بازار گئی ہیں' جلد ہی آجائیں گی۔

وہ کھانے کے بعد پھر شو روم گئے اور نصیحت کرگئے کہ دروازہ اچھی طرح بند رکھنا کسی

اجنبی کی آواز پر اسے نہ کھولنا۔ بہو جلد نہ آئے کوئی پریشانی ہو تو فون کر دینا وہ گھر آجائیں گے۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ چودھری اکبر اس کی خواب گاہ میں تھا۔ پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ اپنے باپ کو معصوم کیسے نہ نظر آتی۔ اس نے باپ کی آمد سے پہلے ہی غسل کیا تھا۔ لباس تبدیل کیا تھا۔ چہرے کے کچھ چغلی کھانے والے ہلکے نشانات کو لوشن' کریم اور لپ اسٹک سے چھپایا تھا۔ بے حیائی آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ اس نے نظریں جھکا کر باپ سے باتیں کی تھیں اور باپ کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ وہ جوان بیٹی کو نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا اور یوں لٹی ہوئی معصومیت کا بھرم رہ گیا۔

سہ پہر تین بجے سلمٰی نے منگلا سے فون پر فیروزہ کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ "میری سہیلی! خیریت سے ہو؟"

"بھابی آپ نے سہیلی بن کر دھوکا دیا ہے۔"

"سہیلی! یہ تو مانتی ہو کہ اس فریب نے آج تمہیں لالہ و گل بنا دیا ہے۔"

وہ ذرا شرمائی اور کھل کر مسکرائی پھر ریسیور اکبر کو دیتے ہوئے بولی "تمہاری آپا ہیں۔"

وہ ریسیور لے کر بولا "ہیلو آپا! تمہاری مرضی سے مجھے فیروزہ کی یادگار محبتیں مل رہی ہیں۔"

"اس خوشی میں میری عزت کا خیال رکھو۔ ابھی تک وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا کر رہا ہوں۔"

"بس وہاں سے فوراً" نکل جاؤ میں تمہارے بہنوئی کے ساتھ آرہی ہوں۔"

"اچھا میں جارہا ہوں۔"

"ریسیور رکھتے ہی چلے جاؤ۔ میرا خیال کرو مجھے اس گھر میں زندگی گزارنی ہے۔"

"بھئی جارہا ہوں۔ تم تو پیچھے پڑگئی ہو۔"

وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر فیروزہ سے بولا "تم سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا مگر جانا پڑے گا۔ آپا اور جواد بھائی آرہے ہیں۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئے اکبر نے قمیض پہنتے ہوئے آئینے میں دیکھا' کنگھی سے بالوں کو درست کیا۔ فیروزہ پاس آکر اس کی پشت سے لگ گئی پھر بولی "میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"میری جان میں پھر آؤں گا۔"

"کب آؤ گے؟ جب تک نہیں آؤ گے یہ کمرا مجھے ستائے گا۔"

"تم نے بتایا ہے کہ آپا کی خواب گاہ کا دروازہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف کھلتا ہے۔ میں اسی پچھلے دروازے سے آؤں گا۔"

"لیکن اس خواب گاہ میں بھائی جان سوتے ہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو- یہ آپا کا مسئلہ ہے وہ نمٹ لیں گی-"

وہ باتیں کرتے ہوئے بڑے ڈرائنگ روم میں آئے- وہاں سے بیرونی دروازے پر آکر اسے کھولا باہر لان میں اور کوٹھی کے احاطے میں کوئی نہیں تھا- فیروزہ نے مطمئن ہوکر اکبر کو باہر آنے کے لیے کہا- پھر اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی احاطے کے گیٹ تک جانے لگی- وہ بہت خوش تھا- بڑی زندہ دلی سے بول رہا تھا لیکن فیروزہ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی- وہ گیٹ کھولنے سے پہلے بولی- "میں تمہارے بغیر اندر سے خالی خالی رہوں گی- میں ساری رات جاگتی رہوں گی، تمہارے انتظار میں صبح کر دوں گی-"

"تم اطمینان رکھو- میں فون پر آپا سے معاملات طے کروں گا کہ وہ کس طرح اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ استعمال کرنے دیں گی اور یہ کب ممکن ہوگا جب بھی ممکن ہوگا میں چلا آؤں گا-"

وہ تھوڑی دیر تک اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیئے کھڑی رہی- آنکھوں سے دل کی باتیں کرتی رہی- باہر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا- پھر اس نے گیٹ کے چھوٹے بغلی دروازے کو کھول دیا- اسی وقت ایک ٹیکسی سامنے آکر رک گئی- اکبر آدھا دروازے کے اندر تھا- آدھا باہر نکل چکا تھا اور فیروزہ کی امی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر آرہی تھیں- دونوں کی نظریں ٹکرائیں بلکہ تینوں کی نظریں کیونکہ اکبر کے پیچھے فیروزہ بھی نمایاں ہوگئی تھی-

امی جان بیٹی اور اکبر کو ایک ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گئیں- پہلا سوال یہی کیا "سلمیٰ رانی کہاں ہے؟"

ماں کی ناگہانی آمد نے بیٹی کو ذرا بدحواس کردیا- اکبر نے سنبھالا دیا- "وہ ابھی ابھی بازار گئی ہیں- آتی ہی ہوں گی-"

انہوں نے گھور کر اکبر کو دیکھا- پھر کہا "میں نے تم سے نہیں پوچھا تھا تم جاسکتے ہو-"

وہ فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی احاطے کے اندر آئیں- بغلی دروازے کو بند کیا- پھر ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے اندر اسے لے آئیں- فیروزہ حواس قائم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور محاسبے کے وقت اپنے بچاؤ کے لیے جوابات سوچ رہی تھی- اس کی امی ڈرائنگ روم میں آکر چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھیں- کچھ جاسوسی کا انداز تھا- وہ کچھ سمجھنا چاہتی تھیں- پھر بولیں "وہ کب آیا تھا؟"

"ابھی دس منٹ پہلے-"

"اور سلمیٰ تجھے اپنے بھائی کے پاس اکیلی چھوڑ کر چلی گئی؟"

"زیادہ دور نہیں گئی ہیں- آتی ہی ہوں گی-"

"تو سچ نہیں بولے گی؟"

"امی! آپ خواہ مخواہ شبہ کر رہی ہیں- کیا آپ کو اپنی بیٹی پر بھروسہ نہیں ہے-"

"میں ماں ہوں- تجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے- تو میرے پیٹ سے پاؤں نکال کر

میرے ہی منہ پر لات مار رہی ہے-"

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ پھر ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اور ایک سمت لے جاتی ہوئی بولیں- "ابھی بتاتی ہوں-"

اس کی امی عمر کا پچاسواں برس گزار رہی تھیں- دیسی خالص گھی اور دودھ مکھن ہضم کرتی آئی تھیں اس لیے ہاتھ پاؤں کی پہلوان تھیں- جوان بیٹی کو کبھی کھینچتی ہوئی کبھی رگیدتی ہوئی لے جارہی تھیں- پھر اس کی خواب گاہ میں آکر ٹھہر گئیں- وہاں کی بے ترتیبی بستر کی ابتری اور چادر کی شکنوں پر پڑا ہوا ہیروں کا نیکلس زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا کہ ابھی ابھی سکندر اعظم فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا گزرا ہے-

تاریخ بتاتی ہے کہ سکندر جہلم تک آیا تھا- تمام دنیا کو فتح کرنے کے عزم سے بے شمار ممالک کو تسخیر کرتا اور تابع بناتا رہا تھا- اس کے متعلق یہ متفقہ رائے قائم ہوگئی تھی کہ دنیا کی کوئی فوجی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکے گی- ایسی پسپائی کے دور میں جہلم ایک ایسا غیرت مند دریا تھا جس نے فاتح اعظم کو بھاری لشکر سمیت آگے بڑھنے سے روک دیا- چند آستین کے سانپوں نے اسے ایک رات وارا پور کے نشیبی علاقے سے دریا پار کرایا- اس نے پورس کو شکست دی لیکن حالات کے ریلے نے اسے پھر جہلم کے مغربی کنارے پر واپس پھینک دیا- دنیا کی کوئی بھی فوج کسی ملک یا شہر میں جاتی ہے تو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے وہاں سے اناج اور ہوس کی بھوک مٹانے کے لیے جوان عورتیں حاصل کرتی ہیں- جہلم کے عوام نے اسی حکمت عملی سے اتنی بڑی فوج کو واپس جانے پر مجبور کیا کہ انہوں نے اناج کی قلت پیدا کردی- اپنی بہو بیٹیوں کو ان کے ہاتھ لگنے نہیں دیا- سپاہی بھوک اور بیماری سے حوصلہ ہار گئے تو کبھی نہ پسپا ہونے والی فوج اس زمین سے واپس چلی گئی-

دکھ یہ تھا کہ آج کے سکندر ہوس کا دریا پار کر جاتے ہیں اور انہیں روکنے کی احتیاطی تدابیر ناکام ہوجاتی ہیں- اس ناکامی کی تہہ میں کوئی لعنت جڑ پکڑ گئی ہے جو سمجھ میں آتے ہوئے بھی سمجھ میں نہیں آتی-

ماں نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا- وہ لڑکھڑا کر سنگار میز کے پاس آکر گری- انہوں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اسے آئینہ دکھاتے ہوئے کہا- "دیکھ! میں نے چہرے پر یہ بے حیا نشان دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ تو نے ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے-"

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے مارتی ہوئی بولیں- "بول! تو اتنی دیوانی کیوں ہوگئی تھی کہ باپ کی سفید داڑھی کا بھی خیال نہ کیا- تیرے غیرت مند بھائی کو معلوم ہوگا تو وہ تیری اور اپنی جان سے کھیل جائے گا-"

وہ غیرت مند بھائی جہلم پہنچ گیا تھا- کوٹھی سے ذرا دور اکبر ان کا منتظر تھا- اس نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رکوائی- پھر کار کی کھڑکی کے پاس آکر سلمیٰ سے بولا- "آپا! میں تم سے ملنے گیا تھا- وہاں صرف فیروزہ تھی، میں اس سے باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر

آرہا تھا تو جواد بھائی کی امی آ گئیں۔ انہوں نے غصے سے پوچھا سلمیٰ کہاں ہے؟ میں نے کہا ابھی بازار گئی ہیں۔ بس یہ سن کر مجھ پر غصہ دکھانے لگیں۔ فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کوٹھی کے اندر لے گئیں۔"

سلمیٰ نے جواد سے کہا۔ "یہ تمہاری امی میرے بھائی کو دیکھ کر مرچیں کیوں چبانے لگتی ہیں۔"

وہ بولا۔ "گھر چلو انہیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"اب آپ گھر جا کر یہ نہیں بتائیں گے کہ منگلا گئے تھے۔ میرے بھائی نے کہا ہے میں ابھی بازار میں ہوں۔ اس لیے آپ بھی یہی کہیں گے ورنہ امی کی غلط فہمی اور بڑھ جائے گی۔"

"میں امی سے کہہ دوں گا کہ میں تمہیں زبردستی منگلا لے گیا تھا۔"

"پھر امی آپ کو بے غیرت کہیں گی کہ جوان لڑکی کو گھر میں تنہا چھوڑ کر بیوی کے ساتھ تفریح کے لیے گئے تھے۔ آپ کیوں بات بڑھانا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر ماں کو مطمئن کر دیں۔"

جواد نے پوچھا۔ "یعنی یہ کہنا ہوگا کہ میں ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا۔ یہیں شہر میں تھا۔"

وہ بولی۔ "ہاں ہم یہیں صبح سے اپنی کوٹھی میں فیروزہ کے ساتھ تھے۔"

"لیکن ابا دوپہر کو گھر آتے ہیں اور ہم گھر میں نہیں تھے۔"

اکبر نے بے اختیار کہا۔ "فیروزہ نے ابا سے بھی یہی کہا تھا کہ آپا تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی ہیں۔"

سلمیٰ نے کہا "ٹھیک ہم کہہ دیں گے ایک بجے دوپہر کو بازار گئے تھے اور دوسری بار اب بازار سے آرہے ہیں۔ باقی تمام دن فیروزہ کے ساتھ رہے۔"

جواد نے کہا "امی کی ناراضگی کا خیال نہ ہوتا تو میں اتنے پیچیدہ جھوٹ نہ بولتا۔"

"رہنے بھی دیں۔ آپ ایسے سچے مومن بھی نہیں ہیں۔ جھوٹ اور رشوت کی کمائی سے بنک بیلنس بڑھا رہے ہیں اور میرے سامنے ہی جھوٹے نہ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

اس طنز کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کی۔ پھر آگے بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ اس نے چونک کر اکبر کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "ابھی تم نے کیا کہا تھا فیروزہ نے دوپہر کو ابا جان سے بھی یہی بہانہ کیا تھا کہ ہم بازار گئے ہیں۔"

اکبر کو پہلے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ایسا کہہ کر وہ خود چور بن گیا ہے۔ جواد نے پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے اکبر! کہ تم دوپہر سے بلکہ صبح ہمارے جانے کے بعد سے فیروزہ کے ساتھ ہو؟"

وہ ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے گھر میں کیا

بدمعاشی ہو رہی ہے۔ اکبر اپنی پوزیشن کلیئر کرو ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

سلمیٰ اپنی طرف کا دروازہ جلدی سے کھول کر بھائی کے سامنے ڈھال بنتی ہوئی بولی۔ ارے رے کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گھر کی عزت باہر اچھال رہے ہیں۔ راستے میں تماشا بنانا چاہتے ہیں۔ چلیں گاڑی میں بیٹھیں اور آرام سے باتیں کریں۔"

اکبر نے کہا "جواد بھائی! کیا ہو گیا ہے۔ ہم بھی بڑک مار سکتے ہیں مگر جو بات آرام سے ہو سکتی ہے اسے آرام سے ہی کریں۔"

سلمیٰ نے اپنے میاں کو پکڑ کر پھر کار میں بٹھایا پھر کہا "واہ کیا عقلمندی دکھائی ہے۔ بہن کے معاملے میں اچھل کر سڑک پر آ گئے۔ تمہیں تو انجینئر نہیں سلطان راہی بننا چاہیے۔"

وہ غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ "بکواس نہ کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ اصل بات کیا ہے؟"

"اصل بات یہی ہے کہ میں ابھی پندرہ منٹ پہلے آپ کے گھر گیا تھا مجھے معلوم ہوا کہ آپا نہیں ہیں تو الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ فیروزہ تشویش ظاہر کر رہی تھی کہ بھابی ابھی تک نہیں آئی ہیں اور وہ دوپہر کو ابا سے بھی جھوٹ کہہ چکی ہے کہ بھابی بازار گئی ہیں۔"

سلمیٰ نے کہا "سن لیا آپ نے وہ بے چاری ہم دونوں کو بزرگوں سے ڈانٹ کھانے سے بچا رہی ہے انہیں یہ نہیں بتا رہی ہے کہ ہم اسے تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ میرا بھائی پندرہ منٹ پہلے گیا تھا۔ صبح سے تمہاری بہن کے پاس نہیں تھا۔ میرے بھائی پر شک کرنے سے بہتر ہے شرم سے ڈوب مریں۔ ابھی گھر جا کر صفائی پیش کرنے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں آپ سے بات کرنا گوارا نہ کرتی۔ ابھی اسی وقت اسی گاڑی میں میکے چلی جاتی۔"

وہ شرمندہ سا ہوا۔ نرم پڑ کر بولا۔ "اکبر مجھ سے چھوٹا ہے۔ اسے غصہ دکھایا ہے تو ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں اس کے کان پکڑ کر اس کی پٹائی بھی کر سکتا ہوں۔"

اکبر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جواد بھائی! میں آپ کا غلام ہوں آپ جوتیاں بھی مار سکتے ہیں۔ آپا کے ساتھ اچھے موڈ میں جائیں اور معاملہ کو نمٹائیں۔"

اس نے پھر کار اسٹارٹ کی۔ امی نے گیٹ کھولا۔ پھر یہ کہہ کر اندر چلی گئیں کہ میرے کمرے میں آؤ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

سلمیٰ نے کہا۔ "آپ کی امی سیاست دکھا رہی ہیں۔ کیا میری موجودگی میں آپ سے باتیں نہیں کر سکتی تھیں، کیا پتا کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھانے والی ہیں۔"

"میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں۔ وہ جو کہیں گی اس کا معقول جواب دوں گا۔"

"ایک بات یاد رکھیں۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے آپ یہ اقرار نہ کریں کہ فیروزہ کو یہاں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ بس اسی بات پر قائم رہیں کہ ہم تمام دن فیروزہ کے ساتھ رہے تھے۔"

وہ ماں کی طرف گیا۔ سلمٰی اپنی نند کی خیریت معلوم کرنے گئی۔ ماں نے بیٹے کو کمرے میں بلانے کے بعد دروازے کو اندر سے مقفل کرکے چابی اپنی مٹھی میں رکھ لی۔ جواد نے پوچھا۔ "امی! یہ کیا؟ آپ مجھے قید کررہی ہیں؟"

"ہاں تمہاری سلامتی کے لیے یہ ضروری ہے۔ میں جو کہنے والی ہوں۔ اسے سن کر لازمی نہیں ہے کہ تمہیں غیرت آئے۔ کیونکہ جورو کا غلام کبھی غیرتمند نہیں ہوتا۔"

"ابھی تمہیں معلوم ہوگا کہ میں اس کے پیچھے پڑگئی ہوں یا وہ ہماری عزت کا جنازہ نکالنے کی قسم کھاچکی ہے اور تیری جی حضوری سے وہ کامیاب بھی ہوگئی ہے۔"

میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن آپ جو سمجھ رہی ہیں وہ بالکل غلط ہے۔"

"اگر تم اور سلمٰی میری بیٹی کو تنہا چھوڑ کر نہ جاتے اور آج اس کے..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "ہم اسے چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ تمام دن اس کے ساتھ تھے۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو یہاں تمام دن تھے؟"

"جی ہاں۔ صرف دن کے ایک بجے اور ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔"

"ہاں فیروزہ کہہ رہی تھی کہ تم دونوں نے اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا۔"

جب ہم تینوں کہتے ہیں کہ کھانا کھایا تھا تو پھر بے یقینی کیوں ہے؟"

"تم یہ بتاکر یقین دلا دو کہ آج ہمارے ہاں کون سی دال اور کون سا سالن پکایا گیا ہے۔"

اس نے ایک دم سے لاجواب ہوکر ماں کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "میرا بیٹا دوپہر کو کھایا شام کو بھول گیا۔ بہو بیگم بھی بیچاری بھول گئی ہوگی۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بستر پر بیٹھ گیا۔ سلمٰی نے خوب اچھی طرح تیار کرکے امتحان میں بھیجا تھا لیکن وہ پہلے ہی سوال میں فیل ہو کر بھانڈا پھوڑ چکا تھا کہ وہ دونوں فیروزہ کو تنہا چھوڑ کر گئے تھے۔

وہ بولیں۔ "بہتر ہے تم خود ہی آج صبح سے شام تک کی بے حیا سازش کا فسانہ سنادو۔"

"امی! آپ بے حیائی کا لفظ استعمال نہ کریں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔"

"اتنے نہیں ہو تو کتنے ہو؟ کچھ زیادہ ہو؟ یا کچھ کم؟ مگر ہو۔ تمہاری بیوی نے کہا جوان بہن کو سالے کے پاس چھوڑ کر چلو اور تم چلے گئے۔"

وہ گرج کر بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"گرجتے وقت یہ بھی سوچ لیا کرو کہ گھر کی عزت باہر اچھال رہے ہو۔ ذرا ہولے ہو کر بولو۔ صبح بیوی کے ساتھ جاتے وقت تمہارے ضمیر نے تمہیں بہن کی یاد دلائی تھی؟"

اسے یاد آیا کہ اس نے سلمٰی سے کہا تھا کہ فیروزہ گھر میں اکیلی رہ جائے گی اور سلمٰی نے کہا تھا وہ ننھی سی بچی نہیں ہے پھر اپنے گھر کی چار دیواری میں ہے کیا اسے شیر اٹھا کر لے جائے گا؟"

اور وہ قائل ہوکر اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ "امی مجھ سے غلطی ہوگئی مجھے فیروزہ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"بیٹے! میں تمہیں پیدائش کے وقت سے جانتی ہوں۔ تم بزدل ہو کبھی غصہ آئے تو خوب گرجتے ہو مگر برسنے کا وقت آئے تو پیچھے ہٹ جاتے ہو۔"

"امی آپ میری انسلٹ کررہی ہیں۔"

"جو ہوا اسے تسلیم کرو۔ میں نے فیروزہ سے سب کچھ اگلوا لیا ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ چودھری اکبر ہماری عزت مٹی میں ملا گیا ہے۔"

"نہیں۔" وہ گرجتا ہوا اچھل کر کھڑا ہوا۔ ماں نے ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا تو وہ بستر پر گر پڑا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا "امی مجھے جانے دیں۔ میں منہ کالا کرنے والی بہن کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ماں نے ایک چھڑی اٹھا کر اسے مارتے ہوئے کہا "میں نے اسی لیے چابی اپنی مٹھی میں رکھی ہے کہ تو دروازہ نہ کھول سکے اور بہن تک نہ پہنچ سکے۔ تجھے چودھری اکبر کو قتل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ وہ تجھ سے تگڑا ہے۔ افسر سے مار کھا کر آنے والا ملازم گھر کی عورت پر غصہ اتارتا ہے۔"

پھر وہ چھڑی کو ایک طرف پھینک کر بولیں۔ "جب تو تیرہ برس کا ہوا تو میں نے چھڑی سے مارنا چھوڑ دیا تھا۔ پندرہ برس بعد اس لیے تجھ پر چھڑی اٹھائی ہے کہ آج بھی تو غلطیاں کرنے والا نادان بچہ ہے۔ کیا اتنی سے بات نہیں سمجھ سکتا کہ بہن کو گالیاں دینے یا مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"تو پھر کیا ہوگا؟ میں یہ بے عزتی کیسے برداشت کروں گا؟"

"عقل سے کام لوگے تو یہ بے عزتی نہیں رہے گی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"فیروزہ اس کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی پٹائی کی اسے نرمی سے سمجھایا لیکن وہ قسم کھاتی ہے کہ چودھری اکبر سے شادی نہ ہوئی تو اپنی جان دیدے گی۔"

"بکواس کرتی ہے میں ایک منٹ میں اسے سیدھا کردوں گا۔"

"وہ ہم سب کو سیدھا کردے گی ہم اسے بچپن سے دیکھتے سمجھتے آرہے ہیں۔ وہ بلا کی ضدی اور ارادے کی پکی ہے تم جبر کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی مگر جھکے گی نہیں۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ایسے وقت اس کا اوندھا دماغ بیوی کو خوش کرنے کی بات سوچ رہا تھا۔ وہ فیروزہ اور اکبر کے رشتے پر راضی ہو کر بیوی کو بارہ لاکھ کی کار جیتنے کا موقع فراہم کرسکتا تھا۔

ماں نے کہا۔ "میں جو بنیادی بات سوچ رہی ہوں وہ یہ ہے کہ تمہارے ابا دل کے مریض ہیں۔ یہ باتیں ان کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔ تم سلمٰی سے کہو اس کے میکے والے اکبر کے لیے فیروزہ کا رشتہ مانگنے آئیں۔ ہم قبول کرلیں گے۔"

"لیکن ابا جان وٹے سٹے کو برا مانتے ہیں۔"

"میں بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی ہوں۔ کسی کے گھر سے بیٹی لے کر اپنی بیٹی ان کے گھر دینے سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جو شرمناک مسئلہ فیروزہ نے پیدا کردیا ہے اس کے بعد ہمیں آنکھیں بند کرکے اس کا نکاح پڑھا دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے میں سلمٰی سے کہوں گا۔ اس کے میکے والے رشتہ مانگنے آئیں گے۔ آپ دروازہ کھولیں۔"

وہ چابی سے لاک کھولتے ہوئے بولیں۔ "میں فیروزہ کے پاس جارہی ہوں تم بہن کو ایک انگلی بھی نہ دکھانا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"نفرت سے گالی بھی نہ دینا۔"

"نہیں دوں گا۔"

وہ اپنے بیڈ روم میں سلمٰی کے پاس آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "یہ آپ کی امی کیا کرتی پھر رہی ہیں؟ میں ابھی فیروزہ سے ملنے گئی تھی۔ پتا چلا بڑی بی دروازے کو لاک کرکے بیٹی کو کمرے میں قید کرکے گئی ہیں۔"

"امی کو معلوم ہوتا کہ گھر کے چراغ سے آگ لگنے والی ہے تو وہ بہت پہلے فیروزہ کو تم سے بچا کر رکھتیں۔"

"اچھا تو جناب کی امی نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔"

"امی کی باتوں سے ایک عقل آئی ہے کہ ہم لڑکی والے ہیں ہمیں صرف ضرورت کے مطابق بولنا چاہیے لہٰذا میں بات نہیں بڑھاؤں گا۔ آج صبح تم نے کہا تھا کہ فیروزہ کو اپنی بھابی بنانا چاہتی ہو۔"

"ہاں اب بھی یہی کہتی ہوں۔"

"تو پھر اکبر سے کہہ دو۔ اپنے بزرگوں کو ہمارے بزرگوں کے پاس بھیج دے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں میں نے تمہاری خوشی کی خاطر امی کو راضی کرلیا ہے تم کار جیت لو۔"

وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "اوہ جواد! آپ سچ مچ ایک فنٹاسٹک شوہر ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اکبر کو فون کرو۔ وہ آکر اپنی کار لے جائے اور شادی کے سلسلے میں تم سے باتیں بھی کرلے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ آئے گا تو میں اس کے ساتھ باہر جاؤں گی اور اس سے ساری باتیں کرکے آجاؤں گی۔"

"او کے۔ میں غسل کرنے جارہا ہوں۔"

وہ غسل خانے میں گیا۔ کوئی پون گھنٹے بعد اکبر آیا۔ سلمٰی اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر بولی۔ "لمبی ڈرائیو کرو۔ لمبی باتیں ہیں۔ تم بڑے خوش نصیب ہو۔"

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ "فون پر تم نے کہا کہ بڑھیا اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے راضی ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ کم بخت شام کو مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "بھئی بیٹی دینا چاہتی تھی اس لیے گھور کر جائزہ لے رہی تھی۔"

"ویسے آپا! سنجیدگی سے سوچنے کی بات ہے۔ شام کو حالات ہمارے موافق نہیں تھے پھر اچانک سازگار ہوگئے۔"

"فیروزہ بہت ہی خودسر اور ضدی لڑکی ہے۔ میں نے جواد سے اگلوایا ہے وہ ماں کے سامنے قسم کھا رہی تھی کہ چودھری اکبر سے شادی نہ ہوئی تو اپنی جان دیدے گی۔"

اکبر نے مسکراتے ہوئے دل میں اعتراف کیا۔ واقعی فیروزہ جان دینے کی حد تک اسے چاہتی ہے۔ اسی نے اپنی ضد سے گھر والوں کے مزاج بدل دیے ہیں۔ اور فیصلہ اپنے یار کے حق میں کرایا ہے۔

وہ اس بات پر مسکرا رہا تھا لیکن زیادہ خوش نہیں ہو رہا تھا۔ خوشی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی آسمان کا تارا ہو اور اسے توڑ کر لانے میں کامیابی ہو۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ تارا خود ہی ٹوٹ کر اس کی گود میں آئے گا۔ جو اس کی طرف مائل ہوتی تھی اسے حاصل ہو جاتی تھی۔ آج تک کسی کے لیے جوئے شیر لانے کی فکر لاحق نہیں ہوئی قدرت نے اسے زبردست مقناطیس بنایا تھا۔

جب قدرت کی طرف سے کچھ زیادہ ہی خوبروئی اور پرکشش شخصیت عطا ہوجاتی ہے تو وہ شخص مغرور لازمی ہوتا ہے۔ وہ فاتح کی شان سے آتا ہے۔ آنکھیں چار کرتا ہے۔ حواس پر ہلہ بولتا ہے۔ شب خون مارتا ہے۔ فتح کرتا ہے۔ پھر اگلی فتوحات کے لیے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا فاتح کی شان نہیں ہوتی لیکن اس بار چودھری اکبر پلٹ پلٹ کر فیروزہ کو دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار ایک ایسی حسینہ سے دو چار ہوا تھا جو بھڑک کر بجھ جانے والی ہوس کی آگ ہی نہیں تھی ایک بھرپور شاعری بھی تھی۔ شاعری کی کتاب پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھ ڈالو وہ ختم ہوجاتی ہے لیکن اس کے معنی و مفہوم ختم نہیں ہوتے ان کی شعریت بعد میں بھی دل کی تہ میں اترتی رہتی ہے۔ ایک معنی خیز شعر کی سرگوشی کبھی فرصت کے وقت گدگداتی ہے اسی طرح فیروزہ مفتوح ہونے کے بعد بھی اس کے اندر شور

مچا رہی تھی۔

اس نے سلمیٰ سے کہا۔ "میں اس سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔"

"فی الحال یہ ممکن نہیں ہے یوں بھی اب چھپ کر ملنا کیا ضروری ہے؟ کل ہی شادی کا پیغام بھیج دو۔"

"آپا! جب یہ معلوم ہوچکا ہے کہ میں قبول کیا جارہا ہوں تو پھر پیغام بھیجنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تاثر نہیں دینا چاہیے کہ ان کی لڑکی ہمارے لیے بہت اہم ہے بلکہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہئیں کہ میں ان کے لیے بے حد ضروری ہوتا رہوں۔"

"ہاں تمہارا یہ نظریہ درست ہے لڑکی والوں کو ترسا ترسا کر رشتہ قبول کرنا چاہیے لیکن اس میں میرا نقصان ہے؟"

"تمہارا کیا نقصان ہے؟"

"تم نے کہا تھا شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی مجھے یہ کار دوگے۔ اب اس معاملہ میں دیر ہوگی تو میں اس سے محروم رہوں گی تمہیں چاہیے کہ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی شرط نہ رکھو۔ جیسے ہی تمہاری نئی گاڑی آئے مجھے یہ گاڑی دے دو۔"

"نہیں آپا! جو بات طے ہوگئی ہے وہی رہے گی۔ ہاں تمہارے لیے یہ ہوسکتا ہے جب بھی کار کی ضرورت ہوا کرے دو چار روز کے لیے لے جایا کرو۔"

"مجھے ہمیشہ مانگنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ گاڑی تمہاری ہے۔ میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اپنی ضرورت کے وقت لے جاتی ہو' پھر میری کوٹھی میں چھوڑ جاتی ہو۔ بہن بھائی سے مانگتی نہیں ہے۔ اپنا حق لیتی رہتی ہے اب اس موضوع کو ختم کرو میرے مطلب کی بات کرو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم اول نمبر کے مطلبی ہو بولو کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی کہہ چکا ہوں' اپنی نند سے ملاقات کراؤ۔"

"تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو کہتے ہو ابھی حالات بگڑتے بگڑتے بن رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے تم دونوں کی ملاقات والی بات کھل گئی ہے۔ بڑی بی نے فیروزہ کو تالے چابی میں رکھا ہے ورنہ میں اس سے حقیقت معلوم کرلیتی۔"

"وہ بلبل کو کب تک قید میں رکھے گی کوٹھی کی چار دیواری میں آزاد چھوڑنا ہی ہوگا۔"

"وہ کوٹھی کے اندر آزاد رہے گی تو تمہارا بھلا نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے ملنے آؤ گے تو فیروزہ کو پردہ کرایا جائے گا۔"

"پردے میں سو چھید ہوسکتے ہیں۔ بڑی آسانی سے یوں ملاقات ہوسکتی ہے۔ اس گھر کے کسی فرشتے کو خبر نہیں ہوگی۔"

"کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے بیڈ روم کا دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا ہے۔ میں رات کو تمہارے کمرے سے ہوکر فیروزہ کے کمرے میں پہنچ سکتا ہوں اور اتنی ہی رازداری سے واپس آسکتا ہوں۔"

"ہوش میں تو ہو۔ کیوں مجھے پھنسانے والی تدبیر سوچتے ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے جواد کچی نیند سوتے ہیں ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھول دیتے ہیں۔"

"آپا! تم کسی پنڈ میں نہیں رہتی ہو۔ یہاں کئی قسم کی خواب آور دوائیں مل جاتی ہیں۔ میں ابھی تمہیں ایک شیشی خرید کر دیتا ہوں۔ چونکہ جواد بھائی کوئی نشہ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے شیشی کی ایک ہی گولی انہیں آرام سے صبح تک سلائے رکھے گی۔"

"مجھ سے اتنے بڑے بڑے کام کراتے ہو میں کیوں کروں؟ تم میرے لیے کیا کرتے ہو؟ ایک گاڑی دینے کا وعدہ کرکے انتظار میں لٹکا رہے ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں گاڑی تمہاری ہے' وعدہ کے مطابق تمہیں مل جائے گی۔ ابھی اس کی بات نہ کرو۔ کل ملاقات کی خوشخبری سناؤ۔ میں تمہیں دس ہزار کی شاپنگ کراؤں گا۔"

وصال یار کے لیے دس ہزار یا زیورات کا سیٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک رات میں مجرا کرنے والیوں کو اس سے زیادہ دے دیا کرتا تھا۔ البتہ بارہ لاکھ والی کار بہت زیادہ قیمتی تھی۔ رشوت کے حوالے سے سلمیٰ کا نامعقول مطالبہ تھا۔ اس لیے وہ کار کے معاملے میں اسے ٹال رہا تھا۔

فی الحال وہ شاپنگ کی رشوت سے خوش ہوگئی۔ رات کو واپس آئی تو دیر ہوچکی تھی۔ گھر کے افراد کھاپی کر اپنے بستروں پر چلے گئے تھے۔ اس رات فیروزہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ پتا چلا امی نے اسے اپنے پاس سلایا ہے۔

وہ اس حرکت سے جل بھن گئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ساس کا بھروسا اس پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دوسرے دن فیروزہ کبھی لاؤنج میں کبھی کچن میں ماں کے ساتھ رہی لیکن ایک بار اپنی ماں کی نظریں بچا کر بھابی کو مسکرا کر دیکھا اور اس انداز سے جتا دیا کہ وہ ایسے حالات میں بھی اپنی بھابی کی سہیلی ہے۔"

دن کے گیارہ بجے ماں غسل خانے میں گئی تو اس نے سلمیٰ کو ماں کے بیڈ روم کے قریب بلایا پھر پوچھا۔ "بھابی! میں کیا کروں؟ امی مجھے سائے کی طرح لیے پھر رہی ہیں۔"

"کب تک ایسے پھریں گی تم اس بات کی ضد کرو کہ امی کے کمرے میں نیند نہیں آتی ہے۔"

"کل رات میں نے یہی کہا۔ کبھی ٹہلتی رہی کبھی کرسی پر بیٹھتی رہی امی نے کئی بار نیند سے آنکھیں کھول کر سمجھایا گالیاں بھی دیں کہ میں سو جاؤں لیکن میں یہی جتاتی رہی کہ وہاں نیند نہیں آرہی ہے۔"

"شاباش تم بہت سمجھ دار ہو۔"

"مگر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں مجھے اکبر سے بہت کچھ کہنا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ کسی طرح پھر سے اپنے کمرے میں رہنا اور سونا شروع کرو اگر ہماری ملاقات پر پابندی ہوگی تو میں تم سے باتیں کرنے کی کوئی دوسری صورت نکالوں گی۔"

"کیا صورت ہوگی بھابی؟ فون پر امی کا پہرا رہے گا۔"

"میں اکبر سے کہوں گی وہ تمہارے لیے واکی ٹاکی لے آئے گا۔ تم اسے چھپا کر رکھوگی۔ اس کے ذریعے ہم رازداری سے باتیں..."

وہ بات پوری نہ کرسکی۔ غسل خانے سے ماں نے پکارا۔ "فیروزہ! کہاں ہو؟ ادھر آؤ۔"

"آئی امی!" وہ فوراً" ہی بھابی کو چھوڑ کر دوڑتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ سچ مچ پچھلی رات ماں کے کمرے میں جاگتی رہی تھی۔ اسے یہ خواہش جگاتی رہی تھی کہ جس کمرے میں اکبر کے ساتھ دن گزارا تھا' وہیں رات گزارے۔ اس خالی بستر پر اپنے پورے وجود کو بچھا کر محبوب کی یادوں سے ملاقات کرتی رہے۔ یار نہ رہے خیال یار تو سلامت رہے۔

ماں نے غسل خانے سے نکل کر بیٹی کو دیکھا۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اونگھ رہی تھی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ ایسی ضدی تھی کہ دن کے وقت بھی ماں کے کمرے میں نہیں سونا چاہتی تھی۔

وہ غصہ سے بولیں۔ پتا نہیں کون سی شیطانی گھڑی تھی جب یہ ضدی اولاد پیدا ہوئی تھی۔ رات سے کہہ رہی ہوں سوجا۔ تھوڑی دیر کے لیے مرجا۔ کم بخت مرتی بھی نہیں ہے۔"

"فکر نہ کریں امی! میں اسی طرح جاگتے جاگتے مرجاؤں گی۔"

انہوں نے الماری کھولتے ہوئے کہا "میرے کمرے میں میرے بستر پر تجھے کانٹے چبھتے ہیں۔"

وہ الماری کی دراز سے ایک چابی نکال کر فیروزہ کے منہ پر پھینکتی ہوئی بولیں۔ "جا اپنی میت اپنے کمرے میں لے جا مگر خبردار! بھابی کے پاس زیادہ گھسے گی تو پھر چابی چھین لوں گی۔ تجھے اپنے ہی کمرے میں بند رکھوں گی۔"

وہ فرش پر سے چابی اٹھا کر کمرے سے باہر آگئی۔ ماں کی ایک مجبوری تھی۔ بیٹی کو ہر رات اپنے کمرے میں سلا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ بیٹی کے ابا وہاں سویا کرتے تھے۔ اس رات انہوں نے خاوند سے کہا تھا۔ "آپ ایک رات مہمان خانے میں سو جائیں۔ آج فیروزہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔"

چونکہ ایک رات کی بات تھی چودھری عنایت حسین نے ماں کے لیے بیٹی کا لاڈ پیار سمجھ کر وہ رات دوسرے کمرے میں گزاری۔ دوسری رات کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا تھا اور وہ خاوند سے کہہ نہیں سکتی تھیں کہ آئندہ بیٹی کے کمرے میں رات گزارا کریں گی۔ اس بات پر خاوند ضرور پوچھتا کہ بیٹی کی پہریدار کیوں بن گئی ہو؟

اس سوال کے کئی شرمناک جواب ہوتے جسے وہ شریف اور غیرت مند باپ برداشت نہ کرتا۔ اسی لیے ماں نے شکست کھاکر بیٹی کو اس کے کمرے کی چابی دے دی تھی۔

وہ چابی لے کر کوریڈور میں آئی۔ سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ پھر وہ دوسری سمت مڑنے والی راہداری میں پہلا کمرا اس کا تھا اور آخری کمرا بھابی کا۔ وہ بھابی کے دروازے پر آکر اسے کھول کر ایک چٹکی میں چابی کو جھلاتی ہوئی بولی۔ "بھابی! یہ رہی چابی۔ اب میں اپنے کمرے میں رہا کروں گی۔"

سلمٰی نے قریب آکر پوچھا۔ "امی! اتنی جلدی راضی کیسے ہوگئیں؟"

"جیسے بھی ہوگئیں۔ آپ کچھ روز مجھ سے دور رہیں اور شام تک میرے لیے واکی ٹاکی لے آئیں۔ میں سونے جارہی ہوں۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ راہداری کے موڑ پر اس کی امی کھڑی ہوئی تھیں۔ بیٹی اور بہو کو گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ بہو نے بے پروائی سے اونہہ کہہ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ فیروزہ بھی اپنا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

ان لمحات میں ماں کے دل کی گہرائیوں سے بددعا نکلی میرے معبود! تو قادر مطلق ہے۔ میری بچی کو بہو کے شر سے بچا۔ ایسی بہو کو غارت کردے جو گھر کو آگ لگاتی ہے اگر تو اسے غارت نہ کرے سزا نہ دے تو عقل اور شرافت ہی دیدے۔

ساس نے بہو کے حق میں بددعا بھی کی اور دعا بھی مانگی لیکن جس طرح ایک چھت کے نیچے ساس اور بہو خوش نہیں رہتیں اسی طرح بیک وقت دعا اور بددعا قبول نہیں ہوتی اگر دعا قبول ہو بہو کو عقل آئے تو ساس اور بہو ایک ساتھ ہنسیں گی جبکہ ایک چھت کے نیچے ایسے معجزے نہیں ہوتے۔

شام کے وقت سلمٰی نے ساس اور سسر کو کمرے میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی وہاں سے ایک چھوٹا پیکٹ اٹھایا۔ پھر فیروزہ کے پاس آکر بولی۔

"اس پیکٹ میں واکی ٹاکی ہے۔ میں جارہی ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کرلو۔ میں ابھی اپنے کمرے سے بات کروں گی۔"

وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے ہدایات دے کر چلی گئی۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ پیکٹ کھول کر واکی ٹاکی کو نکال کر دیکھا۔ ایک منٹ بعد ہی اشارہ موصول ہوا۔ اس نے ایریل کو باہر کھینچ کر ایک بٹن کو دبایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا

"ہیلو میں بول رہی ہوں۔"

سلمیٰ کی آواز آئی "اور میں ہوں تمہاری سہیلی۔ موجد حضرات کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے ایسی چیزیں ایجاد کرکے عشق کو آسان بنادیا ہے۔ ہمارے بزرگ لاکھ پہرے بٹھاتے رہیں۔ محبوب سے کھل کر گفتگو ہوتی رہے گی۔"

"میری پیاری بھابی! کیا اکبر سے بھی گفتگو ہو سکتی ہے؟"

"ہاں اس کے پاس بھی ایک واکی ٹاکی ہے۔ وہ اس وقت ہماری کوٹھی کے پیچھے احاطے کے باہر ہے۔ گھڑی دیکھو چار بج رہے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ تم سے رابطہ کرے گا۔"

"میں آپ سے کب رابطہ کروں؟"

"تم کبھی مخاطب نہ کرنا۔ تمہارے بھائی جان کو معلوم ہوجائے گا کہ ہم دونوں کے پاس یہ خفیہ ذریعہ ہے۔ میں خود ہی موقع دیکھ کر تم سے بات کروں گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ فیروزہ نے واکی ٹاکی کو آف کیا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے چہرے کے سامنے لاکر یوں دیکھنے لگی جیسے چودھری اکبر کو دیکھ رہی ہو۔ وہ دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا ابھی اپنی آواز کا جادو جگانے والا تھا۔ دس منٹ میں ابھی تین ہی منٹ گزرے تھے باقی سات منٹ پہاڑ لگ رہے تھے۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ جب تک اس سے سلسلہ کلام جاری رہے امی پر غفلت طاری رہے انہیں بیٹی کا خیال نہ آئے اور دروازے پر کوئی دستک نہ دے۔

دعا مانگتے مانگتے دس منٹ گزر گئے وہ بے چینی سے گھڑی کو اور کبھی واکی ٹاکی کو دیکھنے لگی۔ اس پر محبوب کا چہرہ جھلک رہا تھا مگر وہ خاموش تھا وہ اسے چوم کر بولی "اے چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ تو بولو پیار گونگا نہیں ہوتا۔"

اس نے جیسے سن لیا اشارہ موصول ہونے لگا اس نے پھر ایریل کو باہر کھینچا بٹن کو دبا دیا۔ پھر اسے کان سے لگا کر بولی "ہیلو میں ہوں۔"

اس کی آواز کان کے راستے دل میں گونجنے لگی "جان من! اُدھر تم ہو اِدھر میں ہوں بیچ میں ایسی دیواریں ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے یہی کیا کم ہے کہ تمہاری آواز سن رہا ہوں اور اپنی سنا رہا ہوں۔"

وہ ذرا چپ ہوا اس نے کہا "بولتے رہو پتا نہیں چلتا تم بولتے ہو یا منتر پڑھتے ہو میرے دماغ پر میری دنیا پر ایسی دھند چھا جاتی ہے کہ نہ کوئی دوسرا دکھائی دیتا ہے' نہ سنائی دیتا ہے۔"

"میں دکھائی بھی دینا چاہتا ہوں۔ اتنے سخت پہرے کے باوجود تم جب بھی مجھے بلاؤ گی میں تمہاری ریشمی بانہوں کے پھندے میں چلا آؤں گا۔"

"اچھا تو میں پھندا ہوں؟"

"جانی! تیرے پھندے میں سنگینی بھی ہے رنگینی بھی۔ ایسی ہی اسیری میں کہا جاتا ہے:

کہ رہائی ملے گی تو مرجائیں گے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ کسی کو یوں جیت کرکے خوشی نہیں ہوتی۔ اس نے پوچھا "ابھی تم کہہ رہے تھے میں جب بھی بلاؤں گی تم چلے آؤ گے؟"

"نہیں بلاؤ گی تب بھی آؤں گا تم میری چیز ہو میں جب چاہوں تمہیں حاصل کرسکتا ہوں۔"

"اس دعوے میں کتنی صداقت ہے؟"

"میں آج رات تمہارے کمرے میں آؤں گا۔"

"میں خوشی سے مرجاؤں گی مگر بچوں کی طرح نہ بہلاؤ یہ ناممکن ہے۔"

"میں ممکن بنادوں گا میری جان۔"

"تم بڑے مضبوط لہجے میں بول رہے ہو پلیز بتاؤ کیسے آسکتے ہو؟"

"ایسے کہ تمہارے بھائی جان گہری نیند میں ہوں گے۔ میری آپا پچھلا دروازہ کھول دیں گی۔ ان کے کمرے سے تمہارے کمرے کا دروازہ تقریباً آٹھ فٹ کے فاصلے پر ہے۔"

"نہیں اکبر! ایسے نہ آنا۔ بھائی جان کچی نیند سوتے ہیں ہلکی سی آہٹ سے اٹھ جاتے ہیں۔"

"تم اپنے بھائی کے متعلق یہ بھی جانتی ہوگی کہ وہ کھانے کے بعد چائے پیتے ہیں۔ آپا اس چائے میں نیند کی دوا ملادیں گی۔"

وہ سوچ میں پڑگئی دل اس سے ملنے کے لیے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور کمزور پڑنے والا ضمیر کہہ رہا تھا بھائی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

وہ شش و پنج میں تھی اکبر نے پوچھا "ہیلو خاموش کیوں ہوگئیں؟"

وہ کمزور سے لہجے میں بولی "یہ اچھی بات نہیں ہے میرے بھائی کو بے ہوش رکھا جائے گا۔ یہ سن کر ہی دل خراب ہو رہا ہے۔"

"بچے کو لوریاں سناکر اور بے خوابی کے مریض کو دوائیں کھلا کر سلانا کوئی جرم نہیں ہے۔ ہم انہیں بے ہوش نہیں کر رہے ہیں۔ تمہارے بھائی جان میرے بہنوئی ہیں میرے لیے بھی اتنے ہی محترم ہیں۔ وہ ڈیوٹی سے تھک کر آتے ہیں انہیں صبح تک گہری نیند سلانا آپا کا فرض ہے۔ اگر تم اسے دشمنی سمجھتی ہو تو کوئی بات نہیں میں ملنے نہیں آؤں گا۔"

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے بولی "تم آنے کی بات کہہ چکے ہو۔ نہیں آؤ گے تو رات نہیں گزرے گی لیکن ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیسا ڈر؟"

"امی میرے سلسلے میں بہت پریشان اور محتاط ہیں۔ وہ میری لاعلمی میں نگرانی کر رہی ہوں گی اگر رات کے وقت تم ان کی نظروں میں آؤ گے تو پھر کیا ہوگا؟"

"خواہ مخواہ اندیشوں میں مبتلا ہو رہی ہو۔ تمہاری امی رات بھر پہرا نہیں دیں گی۔"

"اگر ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا؟ کسی طرح مجھے حوصلہ دو۔"

"اگر دیکھ لیا جاؤں گا تو صاف صاف کہہ دوں گا کہ تم سے شادی کر رہا ہوں مرد کا بچہ ہوں کل ہی برات لے کر آجاؤں گا۔"

"تم واقعی مردوں والی باتیں کرتے ہو۔ میں تو تمہاری ایک ایک بات پر قربان ہونے لگتی ہوں۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ بتاؤ کب آؤ گے؟"

"میں دس اور گیارہ بجے کے درمیان تم سے رابطہ کرکے بتاؤں گا۔"

"ہائے کب شام ڈھلے گی کب رات آئے گی۔ انتظار کرو تو وقت رک جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ابھی اسی لمحے سے ساری دنیا سوجائے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "اسی طرح خیالوں میں رت جگا مناتی رہو انتظار کی گھڑیاں آسانی سے گزر جائیں گی۔ اب میں جارہا ہوں تمہاری کوٹھی کے پیچھے زیادہ دیر رہنا مناسب نہیں ہے۔ دس بجے کے بعد ملاقات ہوگی۔"

"جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں جانے دوں مگر مجبوری ہے۔"

"فیروزہ میں نے اپنے واکی ٹاکی پر ہونٹ رکھ دیے ہیں۔"

فیروزہ کے بدن میں حرارت سی دوڑ گئی۔ اس نے بھی اپنے لبوں کو اپنے واکی ٹاکی پر رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر تشنہ لبی دریا دریا پہنچ کر تھم گئی۔ واکی ٹاکی بجھ گیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسے ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر دستک سن کر چونک گئی۔ جلدی سے اٹھ کر الماری کھولی۔ واکی ٹاکی کو کپڑے میں لپیٹ کر چھپانے لگی دروازے پر پھر دستک ہوئی وہ بولی آ رہی ہوں۔ بس ایک منٹ۔"

جلدی جلدی میں وہ کپڑا نیچے گر پڑا جس میں واکی ٹاکی تھا۔ اس نے گھبرا کر بند دروازے کو دیکھا۔ پھر دستک سنائی دی۔ وہ فرش پر جھک کر اسے اٹھاتے ہوئے اور پھر سے کپڑے میں لپیٹتے ہوئے بولی "آرہی ہوں ذرا تو صبر کریں۔"

اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کپڑے کو الماری کے اندر رکھا اس کے پٹ بند کیے پھر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کی طرف آئی اس بار ماں کی آواز آئی "تیرا ایک منٹ کب پورا ہوگا اور یہ دروازہ کب کھلے گا؟"

وہ دروازہ کھول کر بولی "توبہ ہے امی! آپ تو دروازے پر دھماکے کر رہی ہیں۔ کیا میں کھڑکی توڑ کر بھاگ رہی تھی؟"

ماں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں آئی وہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کی چوکھٹ میں لوہے کی جالی لگی تھی۔ کوئی کوٹھی کے پیچھے سے آجا نہیں سکتا تھا۔ لیکن کھڑکی کے پاس آکر باتیں کرسکتا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور پچھلے حصے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

ماں نے کھڑکی سے پلٹ کر پوچھا "ہوں تو دروازہ کھولنے میں اس لئے دیر کی کہ اسے

بھاگنے کا موقع مل جائے؟"

"بیٹی پر اتنی بھی بے اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔ برداشت سے بڑھ کر زیادتی ہو تو اولاد گستاخ ہو جاتی ہے۔"

"بے حیا بننے کے بعد گستاخ بننے کے لیے اور کیا رہ جاتا ہے؟ سچ بتاؤ وہ کھڑکی کے پاس آیا تھا اور میرے آتے ہی تم نے اسے بھگا دیا؟"

"آپ تو اتنے یقین سے کہہ رہی ہیں جیسے میری عمر میں یہی کھیل کھیلتی رہی ہیں۔"

ماں نے ایک زور کا طمانچہ مارا "ذلیل کمینی! ماں پر اس بڑھاپے میں کیچڑ اچھال رہی ہے۔"

"کوئی شریف زادی ماں کو گالی نہیں دیتی میں نے صرف گستاخی کا نمونہ پیش کیا ہے۔"

"یعنی دھمکی دے رہی ہے کہ اس سے زیادہ گستاخ اور بے شرم ہوجائے گی؟"

"میں کہہ چکی ہوں۔ زیادتی اولاد کی برداشت سے بڑھ کر نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی جانے لگیں۔ پھر دروازے پر رک کر سوچنے لگیں ابھی بیٹی کو تھپڑ مارتے وقت کمرے میں کچھ دیکھا تھا اور اسے نظرانداز کردیا تھا۔

وہ پلٹ کر کمرے کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر ان کی نظریں الماری پر ٹھہر گئیں اس کے دونوں پٹ بند تھے لیکن اندر رکھے ہوئے ایک کپڑے کا کچھ حصہ باہر جھانک رہا تھا۔ عجلت میں الماری بند کرتے وقت اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کپڑے کا کچھ حصہ باہر کی طرف پھنسا رہ جاتا ہے۔

ماں کے ساتھ بیٹی کی نظریں بھی الماری پر گئیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں گئی اس کا ایک پٹ کھول کر کپڑے کو اندر ٹھونسا۔ پھر بڑی دلیری سے دونوں پٹ کھول کر ماں سے کہا "وہاں سے کیا دیکھ رہی ہیں یہاں آکر شبہ دور کرلیں۔ ہوسکتا ہے مجھے ایک اور طمانچہ مارنے کا بہانہ مل جائے۔"

سامنے پوری الماری بے گناہی کا چیلنج بن کر کھلی ہوئی تھی' وہ الماری کہہ رہی تھی "سانچ کو آنچ نہیں۔ میرے اندر کچھ نہیں۔"

ماں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تونے مجھے نہیں میں نے تجھے پیدا کیا ہے اور بڑے کمال کی بیٹی کو پیدا کیا ہے۔ الماری بند کرلے۔"

وہ پلٹ کر دروازہ کھولتی ہوئی باہر چلی آئیں۔ راہداری کے فرش پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سوچنے لگیں "الماری میں ضرور کچھ تھا۔ اس کی گھبرائی ہوئی دلیری بتا رہی تھی کہ وہ عادی چوروں کی طرح ڈھیٹ بن گئی ہے۔ میں تلاشی لے کر کیا کرتی؟ اس نے اکبر کا کوئی خط چھپایا ہوگا یا کوئی تحفہ۔ میں اس سے خطوط اور تحفے چھین کر اسے گمراہی سے بچا نہیں سکوں گی۔ مار پیٹ سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

وہ بہو اور بیٹے کے کمرے کے سامنے آکر رک گئیں۔ پھر دروازے پر دستک دی۔

دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ سلمٰی نے ساس کو دیکھ کر کہا "امی آپ؟ آئیں اندر آجائیں۔"

وہ بڑے کرب سے بولیں "نہیں بیٹی! میری کمر ٹوٹ رہی ہے۔ اندر نہیں آؤں گی۔ یہیں بتادو تمہارے بزرگ فیروزہ کا رشتہ مانگنے کب آئیں گے؟"

وہ مسکرا کر بولی "ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ کیا بیٹی کہیں بھاگی جارہی ہے؟"

"جس گھر سے تہذیب اور شرافت بھاگ جائے وہاں سے پھر بھاگنے کے لیے بزرگوں کی زندگی رہ جاتی ہے۔ اس گھر میں ہم دو بوڑھے مرنے والے ہیں۔"

"مجھے سن کر افسوس ہو رہا ہے میں دو بوڑھوں کے حق میں دعا کروں گی۔"

"دوا کرو۔ یہی بہت ہے، تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

"میں نے اکبر سے کہا تھا کہ وہ ہمارے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کے لیے بھیج دے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون پر بتایا ہے کہ ہمارے ابا زمینوں پر گئے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں ہماری زمینیں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کام بھی اتنا ہی پھیلا ہوا ہے۔ وہ جب جاتے ہیں تو کئی مہینوں میں واپس آتے ہیں۔"

انہوں نے مایوس ہوکر بہو کو دیکھا کچھ سوچا پھر کہا "تمہاری امی کسی بزرگ کے ساتھ آسکتی ہیں۔"

"میں آپ کا یہ مشورہ اپنے میکے پہنچا دوں گی لیکن ہمارے خاندان میں زمین یا لڑکی خریدتے وقت ابا کی مرضی اور منظوری ضروری ہوتی ہے۔"

"زبان کو لگا دو سلمٰی! ہم شریف لوگ ہیں بیٹیاں بیچتے نہیں بیاہتے ہیں۔ اسی لیے تمہیں بھی خریدا نہیں ہے تم عزت سے یہاں بیاہ کر لائی گئی ہو۔"

"میری عزت تھی اس لیے عزت سے بیاہ کر آئی جس کی عزت نہ رہی ہو اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

ان کے دل پر گھونسا سا لگا وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا جھک گئیں۔ سر کو جھکا لیا پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے واپس ہونے لگیں۔ دل رو رہا تھا پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ بیٹی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک گئیں اس دروازے کو دیکھا پھر اچانک ہی آگے بڑھ کر اس دروازے سے لپٹ کر رونے لگیں۔

پتا نہیں سب سے پہلا دروازہ کب بنا تھا اور کہاں بنا تھا؟

ایک خیال ہے کہ رونے کے لیے پہلا دروازہ جہنم کا بنایا گیا تھا۔

عقل کہتی ہے آدم اور حوا کے درمیان سب سے پہلا شرم کا دروازہ بنایا گیا۔ جب تک دروازہ بند رہا دونوں ہنستے بولتے اور مسرتوں سے مالا مال ہوتے رہے دروازہ کھلتے ہی رونے کا مقام آیا۔ اس سے پہلے حیات آدم میں آنسو نہیں تھے۔

ازل سے موجودہ لمحے تک کسی رشتے نے اتنے آنسو نہیں بہائے جتنے ایک ماں اپنی بیٹی کے دروازے پر بہاتی ہے انہوں نے دروازے سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے کہا "میری نادان بیٹی! کیا میں اپنا سر پھوڑلوں؟ تم لڑکیوں کی سمجھ میں اتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ نکاح سے پہلے مرد کے ہاتھ لگنے والی لوٹ کا مال بن جاتی ہے۔ باسی کھانے کو پھر سے پکاؤ تب بھی وہ تازہ نہیں ہوتا۔ توڑا ہوا پھول کنواری شاخ پر دوبارہ نہیں لگتا اتنی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ میں سمجھانے والی زبان کہاں سے لاؤں میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟"

وہ دروازے کو گھونسے مار رہی تھیں اور نڈھال سی ہوکر فرش پر بیٹھتی جارہی تھیں۔

اسی وقت جواد گھر میں داخل ہوا۔ ماں کی ماتمی آواز سن کر دوڑتا ہوا راہداری میں آیا۔ پھر فرش پر جھک کر ماں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا "امی! کیا ہوگیا ہے؟ آپ فیروزہ کے دروازے پر کیوں رو رہی ہیں؟"

سلمٰی نے قریب آکر کہا "یہ پاگل ہو رہی ہیں۔ کہتی ہیں ہمارے گھر والے آج ہی رشتہ مانگنے آجائیں۔ میں نے سمجھایا کہ ذرا صبر کریں۔ ابا زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی رشتہ طے ہوجائے گا مگر یہ ایک طرف بہو کو کوس رہی ہیں دوسری طرف بیٹی کو گالیاں دینے کے لیے اس بے چاری کے دروازے پر بیٹھ گئی ہیں۔"

جواد نے ناگواری سے کہا "امی! یہ کیا حرکتیں ہیں؟ کیا اس طرح بدنامی باہر نہیں جائے گی؟"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے عاجزی سے بولیں "بیٹے! میں اپنے دودھ کی قسم دیتی ہوں

ماں کی بات پر بھروسا کر تھوڑی دیر پہلے تیری بیوی نے تیری بہن کے لیے کہا ہے کہ اس کی عزت نہیں رہی ہے اس لیے وہ عزت سے بیاہی نہیں جائے گی۔ تیری بہن کو زمین کی طرح بکنے اور خریدنے والی لڑکی کہتی ہے۔"

فیروزہ نے دروازہ کھول کر کہا "امی! میں اپنے کمرے میں تھی میں نے تو بھابی کو ایسا کہتے نہیں سنا۔"

ماں نے کہا "تو کمرے میں تھی۔ یہ بہت چالاک ہے دھیمی آواز میں تجھ پر اور ہم پر کیچڑ اچھال رہی تھی۔"

جواد نے کہا "امی! آپ کو پتا ہے سلمیٰ ہماری فیروزہ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو ابھی بھائی سے نکاح پڑھوا کر اسے بھابی بنالے میری سمجھ میں نہیں آتا آپ روایتی ساس کیوں بن رہی ہیں؟"

"ارے نالائق! میں ساس اس وقت کہلاؤں گی جب تو مجھے ماں سمجھے گا۔ تو نے میرا کیا مان رکھا ہے۔ تجھ میں ذرا سی بھی غیرت ہے تو جلد سے جلد بہن کی غلطی پر پردہ ڈال ابھی اکبر سے بول کہ قاضی کو لائے اور نکاح پڑھالے۔ گناہ کو آگے نہ بڑھائے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جب اس کے ابا زمینوں پر گئے ہوئے ہیں تو..."

وہ بات کاٹ کر گرجتے ہوئے بولیں "جہنم میں گئیں زمینیں۔ تو چاہے تو ابھی اس کے باپ کو زمینوں سے واپس لا سکتا ہے۔"

"میں کیسے بلا سکتا ہوں؟"

"اس کے باپ کے پاس موبائل فون ہے تو فون پر کہہ سکتا ہے کہ اکبر نے تیری بہن سے زیادتی کی ہے لہٰذا کل شام سے پہلے دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔"

"کیا وہ میری بات مان کر ان کا نکاح پڑھوانے آجائیں گے؟"

"اگر وہ آنے سے انکار کریں تو دھمکی دینا کہ بہن عزت سے نہ بیاہی گئی تو اکبر کی بہن کو طلاق دے دے گا۔"

سلمیٰ نے چیخ کر کہا "اب آئی ہے دل کی بات زبان پر ساری دشمنی تو مجھ سے ہے۔ تمہاری ماں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ چھڑالو پیچھا ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کرو مگر یاد رکھو۔ میں اس گھر سے جاکر بھی فیروزہ کو اپنی بھابی بناؤں گی کیونکہ میں اسے نند نہیں سمجھتی یہ میری جان سے زیادہ پیاری سہیلی ہے۔"

فیروزہ اس جذبہ سے بھر گئی کہ سلمیٰ اپنا گھر اجاڑ کر بھی اسے اکبر کی شریک حیات بنانا چاہتی ہے۔ یہی پیاری سہیلی ہونے کا ثبوت تھا۔ وہ آگے بڑھ کر بڑے جذبے سے سلمیٰ کو گلے لگا کر رونے لگی اور کہنے لگی "میں اپنی بھابی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ امی اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ آپ گھر بسانے والی باتیں کر رہی ہیں۔ یا گھر اجاڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔"

ماں نے جواد سے کہا "یہ کہتی ہے میں ہوش میں نہیں ہوں تیرا کیا خیال ہے؟"

"امی! اس وقت جو بھی آپ کی باتیں سنے گا آپ کو نارمل نہیں کہے گا۔"

انہوں نے بڑے دکھ سے بیٹے کو دیکھا وہ حقیقتاً بہو کو طلاق دلانا نہیں چاہتی تھیں۔ بیٹے کو بہن کی لٹی ہوئی عزت کا احساس دلانا چاہتی تھیں محض طلاق کی دھمکی دے کر بیٹی کو اس کا جائز حق دلانا چاہتی تھیں۔

انہوں نے شکست کھا کر سر کو جھکا لیا۔ وہاں سے جانے لگیں۔ جواد نے آواز دی "امی! فیروزہ کی ذمے داری مجھ پر ہے' آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور ایک خوشخبری سنیں۔"

ماں رک گئی۔ بیٹے نے کہا "سلمیٰ ماں بننے والی ہے اور آپ دادی۔"

وہ بولیں "خدا تم سب کو شاد و آباد رکھے۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ ایک پھانس اٹکی ہے وہ نکل جائے تو ہم جشن منائیں گے۔"

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر ایک صوفے میں گرنے کے انداز میں دھنس گئیں۔ یوں دلدل میں دھنسنے کا گمان ہو رہا تھا۔ اکبر ایک جونک کی طرح فیروزہ کے وجود سے چمٹ گیا تھا۔ اس جونک کو ہر طرح سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ فیروزہ کے بدن کو نہیں چھوڑ رہی تھی۔

یہ آزمودہ نسخہ ہے کہ جونک بدن کو نہ چھوڑ رہی ہو تو ایک چٹکی نمک اس پر ڈال دیا جائے وہ فوراً بدن کو چھوڑ کر مرجاتی ہے اسے مارنے اور الگ کرنے کا دوسرا طریقہ نقصان دہ ہوتا ہے اسے جبراً کھینچ کر الگ کرو تو وہ جسم کے اس حصے کی کھال نوچتی ہوئی علیحدہ ہوتی ہے اور وہاں زخم چھوڑ جاتی ہے۔

ماں نے ہر ممکن کوشش کرلی اور ہر کوشش کے نتیجے میں بیٹی پہلے سے زیادہ زخمی دکھائی دی۔ جونک نے چمٹنے کے عمل کو اور زیادہ تشویشناک بنا دیا۔ ماں کو وہ چٹکی بھر نمک نہیں مل رہا تھا جس سے نجات بھی حاصل ہو جاتی ہے اور بے حیائی کا داغ بھی مٹ جاتا۔

رات کے آٹھ بجے چودھری عنایت حسین شو روم سے واپس آئے بیگم کا منہ دیکھ کر بولے "کیا بات ہے؟ بہو سے پھر جھگڑا ہوگیا؟"

"نہیں اپنی تقدیر سے جھگڑا کر رہی ہوں۔"

"نیک بخت! بہو بیٹے کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جتنی سانسیں رہ گئی ہیں انہیں کسی طرح پوری کرلو۔ ہمیں اپنی دنیا کو اولاد کے حوالے کرکے جانا ہوتا ہے۔"

"آپ منہ ہاتھ دھو کر لباس بدلیں۔ میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانے کی میز پر آئے پھر انہوں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا "آج چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔"

بیگم نے پوچھا "کون چودھری صاحب؟"

"یہی اپنے سمدھی سلمیٰ کے ابا۔"

بیگم نے چونک کر کہا "لیکن سلمیٰ تو کہہ رہی تھی کہ اس کے ابا زمینوں پر گئے ہیں۔"

"شاید سلمیٰ کو نہ معلوم ہو۔ وہ بیٹی سے ملنے بھی ہمارے ہاں نہیں آتے ہیں۔ کہہ رہے تھے ایک مقدمہ میں ملوث ہیں۔ فرصت ملے گی تو آئیں گے۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولے "مگر چودھری صاحب کہہ رہے تھے کہ سلمیٰ ان سے ملنے شہر والی کوٹھی میں گئی تھی۔ باپ بیٹی کی ملاقات ہوئی تھی پھر اس نے یہاں باپ کی موجودگی کو کیوں چھپایا ہے؟؟"

بیگم نے بڑے کرب سے ایک گہری سانس چھوڑی۔ وہ خاوند سے نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ہماری جوان بیٹی کو بے حیائی کی مٹی میں رلنے کے لیے چھوڑا جارہا ہے۔ باپ بیٹی اور بیٹا یہاں آکر فیروزہ کا رشتہ مانگنا نہیں چاہتے۔ جھوٹ اور فریب سے اس گھر کی عزت کو خاک میں ملایا جارہا ہے۔"

چودھری عنایت حسین نے پوچھا "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ بولیں "کچھ نہیں۔ اب سوچنا کیا ہے۔ جھوٹوں کے خاندان سے بہو لائے ہیں' یہ رشتہ نباہنا ہی ہوگا۔"

"لیکن اس جھوٹ کا مطلب کیا ہوا کہ ابا زمینوں پر گئے ہیں؟"

"ایسا کہنے میں ان کی مصلحت ہوگی۔ کچھ فائدے حاصل ہو رہے ہوں گے' آپ ان معاملات میں سر نہ کھپائیں۔ آرام سے روٹی کھائیں۔"

وہ خود آرام سے روٹی نہیں کھا رہی تھیں۔ لقمہ چبا کر نگلنا چاہتی تھیں مگر لقمہ الٹ کر باہر آنا چاہتا تھا۔ وہ خاوند کو کھلانے کے لیے جبراً کھا رہی تھیں۔ اب یہ فریب پوری طرح واضح ہوگیا تھا کہ فیروزہ جب تک کھلونا بنتی رہے گی کھیلنے والا کھیلتا رہے گا۔ بہن معاون ومددگار رہے گی۔ اس گھر میں رہ کر گناہ کے چور دروازے کھولتی رہے گی۔

فریب واضح ہونے کے بعد وہ نئے حوصلوں سے سوچ رہی تھیں کہ بیٹی کی نگرانی اور سختی سے کریں گی۔ اسے سلمیٰ اور اکبر کے طلسم سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہیں گی۔ بدی سے جنگ کرو تو ابتدا میں مایوسی ہوتی ہے پھر بدی کا منہ توڑ جواب دینے کے راستے نکلتے رہتے ہیں۔

نگرانی کے لیے یہ طے کرلیا کہ آج سے کچھ راتیں جاگتی رہیں گی۔کیونکہ چوروں اور گناہ گاروں کے لیے رات کی تاریکی سازگار ہوتی ہے۔ پھر شام ہی سے کالے بادل چھا رہے تھے۔ رات دس بجے تک بارش ہونے لگی تھی۔ انہیں خاوند کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق نیند کی گولیاں کھا کر سوتے تھے۔ انہیں اس بات کا پتا نہ چلتا کہ ماں بیٹی کو گمراہی سے بچانے کے لیے صبح تک جاگ رہی ہے۔

وہ پونے گیارہ بجے اپنے کمرے سے نکلیں راہداری میں نیم تاریکی تھی بارش کے باعث ہلکی سی خنکی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی دوسری راہداری میں آئیں پہلے بیٹی کے اور پھر بہو کے دروازے کو دیکھا۔ دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ انہوں نے بیٹی کے

دروازے سے لگ کر پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ گہری خاموشی تھی۔ پوری کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تقریباً" پندرہ منٹ تک اسی طرح کوئی آواز یا آہٹ سننے کی توقع کرتی رہیں۔ پھر مطمئن ہوکر وہاں سے ہٹ گئیں۔ اپنے کمرے میں واپس آگئیں۔

چودھری عنایت حسین گہری نیند میں تھے۔ اب بیگم کو بھی سو جانا چاہیے تھا مگر عجیب سی بے چینی تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ بیٹی کے دروازے سے مطمئن ہوکر آئی تھیں لیکن وہاں کی خاموشی پراسرار لگ رہی تھی۔ بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ایسے میں سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ باہر سے کوئی آئے گا یا اندر سے کوئی باہر جائے گا لیکن نہ سوچو تب بھی شبہ ہوتا ہے بعض اوقات بڑی وارداتیں بھری برسات میں ہوا کرتی ہیں۔

وہ اپنے کمرے میں سکون سے نہ بیٹھ سکیں پھر آہستگی سے کمرہ کھول کر راہداری میں آگئیں۔ وہاں سے چلتی ہوئی دوسری راہداری میں پہنچیں۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور خوب برس رہے تھے زمین جل تھل ہو رہی ہوگی اندر پانی نہیں تھا۔ وہ ننگے پاؤں فرش پر چل رہی تھیں پھر چونک کر رک گئیں۔

فیروزہ کے دروازے کے سامنے فرش تھوڑا گیلا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب آئی تھیں تو وہ فرش گیلا نہیں تھا۔ بالکل خشک تھا۔ وہاں کی نیم تاریکی میں کچھ اچھی طرح قدموں کے نشانات نظر نہیں آسکتے تھے لیکن یہ طے تھا کہ کوئی باہر سے بھیگ کر آیا ہے۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی بہو کے دروازے تک گئیں فرش اس دروازے تک نم تھا۔ یہ یقینی اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہو کے دروازے سے نکل کر بیٹی کے دروازے میں غروب ہوگیا ہے۔

اگرچہ بوڑھی ماں کو وہاں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا مگر بے چاری نے مارے شرم کے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ان لمحات میں ڈوب مرنے کی شدید خواہش ہو رہی تھی' مگر عقل کہہ رہی تھی مرنے سے بیٹی کو اور آزادی سے نوچا کھسوٹا جائے گا۔ زندہ رہنا اور ایسا کچھ کر گزرنا چاہیے کہ یہ بے حیائی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

وہ بیٹی کے دروازے پر آئیں۔ وہاں کان لگا کر کچھ سننے اور کسی کی موجودگی کی تصدیق کرتے شرم آرہی تھی۔ اول تو گناہ گار خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں پھر یہ کہ کوئی شرمناک آواز سنائی دی تو وہ کھڑے کھڑے مرجائیں گی۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئیں۔ ان کے اندر شرافت اور حیا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ اگر واقعی شیطان غلاظت پھیلانے گھر میں گھس آیا ہے تو اسے مار ڈال۔ اسے زندہ نہ چھوڑ۔ وہ فیروزہ کو کبھی عزت و آبرو سے دلہن بنا کر نہیں لے جائے گا۔

انہوں نے الماری کھولی پھر ایک دراز کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ وہ اس کی روشنی میں باہر جاکر دیکھنا چاہتی تھی کہ باہر سے کوئی اندر آیا ہے یا نہیں؟

اگر نہیں آیا ہے تو خدا کا شکر ہے اور اگر آیا ہے تو؟

انہوں نے الماری کی اندرونی تجوری کھولی۔ وہاں زیورات اور نوٹوں کی گڈیوں کے درمیان ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے پستول اٹھا لیا۔ باہر زور سے بجلی کڑک رہی تھی۔ اگر کوئی اندر آیا ہے تو اسے آئندہ آنے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

وہ پھر ایک بار کمرے سے باہر آئیں۔ اس بار کچن میں آئیں۔ اس کوٹھی میں دو پچھلے دروازے تھے۔ ایک جواد کے کمرے میں اور دوسرا کچن میں۔ وہ کچن کا دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ بارش کی تیز پھواروں میں بھیگنے لگیں۔ بجلیاں رہ رہ کر چمک رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے احاطے کے باہر پچھلی گلی کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس لیے تاریکی گہری ہوگئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتی ہوئی ایک کھڑکی کے پاس رک گئیں۔ وہ فیروزہ کے کمرے کی کھڑکی تھی۔

بجلی کی لمحاتی روشنی میں کھڑکی بند نظر آئی۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں وہاں سے گزر کر سلمٰی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آئیں۔ وہ کھڑکی بند تھی اس پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ٹارچ روشن کی چند قدم کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ دروازے کے سامنے جو پختہ فرش تھا۔ وہ پانی کی بوچھاڑ سے دھلا ہوا تھا لیکن کیچڑ آلود قدموں کے نشانات تھے جو باہر سے بہو کے کمرے کے اندر گئے تھے۔

بجلی زور سے کڑکتی ہوئی آسمان پر ادھر سے ادھر گئی۔ ایک بجلی ماں کے کلیجے میں اتر گئی تھی۔ پستول پر گرفت مضبوط ہوگئی تھی یہ ثابت ہوگیا تھا کہ عزت کا لٹیرا گھر میں گھسا ہوا ہے۔ اگر اسے گھر میں گولی ماری جائے گی تو بدنامی باہر دور تک جائے گی۔ اگر وہ باہر گلی میں مارا جائے گا تو گلیوں میں کتے مرتے ہی رہتے ہیں۔

وہ تن کر چلنے لگیں احاطے میں کھلے حصے میں آکر وہاں تیز بارش میں بھیگتے ہوئے پلٹ کر دور بہو کے دروازے کو دیکھا۔ وہ بہو کا بھائی اسی دروازے سے باہر آنے والا تھا۔

وہ پھر پلٹ کر چلتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے باہر آئیں۔ وہ بھی اسی گیٹ سے باہر نکلنے والا تھا۔ بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ کڑکتے چمکتی ہوئی بجلیوں کی روشنی میں کچی گلی کیچڑ سے بھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ کنارے کے گڑھوں میں پانی لبالب بھر گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک درخت کے سائے میں آکر کھڑی ہوگئیں۔

وہ دعا مانگنے لگیں "ربا! آج اتنا کرم کردے کہ سب کام خیر خیریت سے ہوجائے اور فیروزہ کے ابا کو کچھ نہ معلوم ہوسکے۔ میرے معبود! تو میرے ارادوں کو سمجھتا ہے میں بیٹی کی غلطیوں کو باپ کے کانوں تک نہیں پہنچانا چاہتی۔ میرے مالک! اس غیرت مند باپ کو کچھ نہ معلوم ہو اور تمام بے حیائیاں آج رات یہیں ختم ہوجائیں۔"

وہ دعا مانگ رہی تھیں اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ انتظار کرتے کرتے دو بج گئے۔ قیامت کا انتظار تھا۔ جب تین بجنے لگے تو بہو کے کمرے کا چور دروازہ بڑی چوری سے کھلنے لگا۔ پہلے بہو نے ذرا باہر نکل کر دور تک آس پاس نظریں دوڑائیں پھر مطمئن ہوکر اشارہ کیا

اشارہ پاکر اکبر باہر آیا۔ بہو اندر چلی گئی دروازے کو بند کرلیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا احاطے سے گزرتا ہوا گیٹ سے باہر آنے لگا۔

وہ سمجھ رہی تھیں اکبر درخت کے پاس سے گزرنے کے لیے ان کی طرف آئے گا لیکن وہ مخالف سمت جانے لگا۔ وہ بھی درخت کے سائے سے نکل آئیں۔ اس کے پیچھے کیچڑ میں پاؤں جما جما کر چلنے لگیں۔ اکبر کو بارش کے شور میں پہلے تو کیچڑ کی چھپ چھپ سنائی نہ دی پھر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اسے تعاقب کا احساس ہوا تھا۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو بیگم عنایت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا "آ... آپ؟"

بیگم نے پستول والا ہاتھ اٹھایا پھر اس پستول کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ... آپ کیا کر رہی ہیں۔ دیکھئے گولی چل جائے گی۔"

وہ شدید نفرت سے بولیں "ذلیل کتے! اس میں جتنی بھی گولیاں ہیں، تیرے لیے کم ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو تجھے دوڑا دوڑا کر اور تڑپا تڑپا کر مارتی لیکن میں بے حیائی کا یہ کھیل ختم کرنے اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے فوراً تجھے جہنم میں پہنچا رہی ہوں۔"

اکبر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جان بوجھ کر کیچڑ میں پھسل گیا۔ ان ہی لمحات میں گولی چلی تھی۔ بجلی کی زوردار کڑکتی ہوئی آواز اور بادلوں کی گرج میں فائرنگ کی آواز گڈمڈ ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتیں، اکبر نے دونوں ہاتھوں سے کیچڑ کو سمیٹ کر ان کے منہ پر اچھال دیا وہ کیچڑ آنکھوں میں گئی۔ آنکھیں نہ ہوں تو گولی کدھر چلائی جائے۔

آنکھوں میں شدید تکلیف ہونے کے باوجود انہوں نے اندازے سے گولی چلانی چاہی لیکن کلائی فولادی گرفت میں آگئی۔ اکبر نے اتنی زور سے کلائی موڑی کہ وہ چیخ پڑیں۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر منہ پر ایک زوردار الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر کیچڑ میں چاروں شانے چت ہوگئیں۔

ایک تو عورت کی کمزوری اس پر اندھے پن والی بے بسی۔ وہ دلدل سے اٹھنا چاہتی تھیں۔ اکبر نے اٹھنے سے پہلے دبوچ لیا۔ وہ پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ بڑی مضبوطی سے ان کی گردن اور سر کو پکڑ کر ان کے چہرے کو کیچڑ میں ڈبو رہا تھا اور کیچڑ میں رگڑ رہا تھا تاکہ اس طرح دم گھٹ جائے۔

اور ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ان کا دم الجھ رہا تھا۔ وہ بدنامی کے ڈر سے چلانا اور مدد کے لیے پکارنا نہیں چاہتی تھیں اور اگر چیخنا بھی چاہتیں تو بار بار کیچڑ میں سانس رکنے کے باعث کچھ بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ گردن پر گھونسے مار مار کر ان کے سر کو کیچڑ اور پانی میں ڈبو رہا تھا اور کہتا جارہا تھا "سور کی بچی! مجھے گولی مارنے آئی تھی۔ کتنی ہی ماؤں کی بیٹیوں کو ہضم کرچکا ہوں تو کوئی نرالی ماں آئی ہے۔ اچھا ہے تیرے بعد راستہ بالکل صاف

رہے گا۔"

منہ ناک اور آدھا چہرہ بڑی دیر سے کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہزار کوششوں کے باوجود منہ اٹھا کر کھلی ہوا میں سانس نہ لے سکیں۔ قوت مدافعت کمزور پڑتے پڑتے بالکل سرد پڑگئی۔ پورا جسم ساکت ہوگیا۔ اکبر نے ہانپتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا شاید ابھی جان باقی ہو لیکن منہ گردن تک اسی طرح ڈوبا رہا۔ اب سانس کے آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک ماں اپنی بیٹی کی پیدا کی ہوئی کیچڑ میں منہ چھپا کر مرگئی تھی۔ چودھری اکبر نے ماں کے مردہ جسم کو ایک ٹھوکر ماری پھر وہاں سے چلا گیا۔

وہ تہذیب اور شرم کی خاطر لڑنے والا جسم وہاں پڑا رہا۔ بارش آہستہ آہستہ تھم گئی وقت چیونٹی کی چال سے گزرتا گیا پھر خاموش فضا میں فجر کی اذان گونجنے لگی۔ دو نمازیوں نے مسجد کی سمت جاتے ہوئے وہ لاش دیکھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے محلے میں ہلچل مچ گئی۔ چودھری عنایت حسین اور ان کے گھر والوں کو تمام محلہ جانتا تھا لیکن بیگم صاحبہ پہچانی نہیں گئیں کیونکہ چہرہ کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پورا جسم کیچڑ سے آلودہ تھا بس اتنا سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کسی عورت کی لاش ہے۔

پولیس والوں نے آکر لاش کو ہاتھ لگایا۔ چہرے کی آلودگی صاف کی تو سب ہی حیرت سے چیخ پڑے "یہ تو بیگم صاحبہ ہیں بیگم عنایت ہیں۔ یہ کوٹھی والی خالہ ہیں...."

انسپکٹر نے چودھری عنایت حسین اور ان کے بیٹے جواد حسین کو بلایا وہ دونوں پچھلی گلی کی بھیڑ میں آئے جواد ماں کی لاش دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ چودھری صاحب چکرا کر کیچڑ میں گر رہے تھے کہ لوگوں نے انہیں سنبھال لیا۔

یہ المناک اطلاع فیروزہ اور سلمیٰ کو ملی فیروزہ تو چیخیں مار کر رونے لگی۔ سلمیٰ تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ محلے کی ایک عورت سے کرید کرید کر تفصیلات معلوم کرنے لگی۔ اندر کی بات کون جانتا تھا کہ یہ قتل کی واردات کیسے ہوئی؟ اس عورت نے اتنا ہی بتایا کہ قاتل نے بیگم صاحبہ کو کیچڑ میں دھنسا کر مارا ہے۔ لاش کے پاس ایک پستول بھی پایا گیا ہے پولیس والے لاش کے ساتھ چودھری صاحب اور جواد کو بھی لے گئے ہیں۔

بڑی کوٹھیوں میں رہنے والی بیگمات افسوس کے لیے سلمیٰ اور فیروزہ کے پاس آنے لگیں۔ سلمیٰ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ پھر فیروزہ کو ایک طرف لے جاکر بولی "میں جانتی ہوں اس وقت تم صدمات سے چور چور ہو لیکن ایسے وقت ہوش و حواس میں رہنے کی ضرورت ہے۔ پولیس والے ہم سے بھی سوالات کریں گے۔ یہ کبھی بھول کر بھی نہ کہنا کہ اکبر یہاں رات کو آیا تھا۔"

فیروزہ نے سوالیہ نظروں سے بھابی کو دیکھا۔ بھابی نے کہا۔ "میں نے معلوم کیا ہے باہر یہ چرچا ہے کہ کسی شخص نے امی کو کیچڑ میں دھنسا کر مارا ہے۔ پولیس والے ہمارے گھر

کے مردوں پر شبہ کریں گے یا ایسے شخص کے متعلق پوچھیں گے جو پچھلی رات ہم سے ملنے آیا ہو۔"

"کیا یہ معلوم ہوا ہے کہ امی رات کو باہر پچھلی گلی میں کیوں گئی تھیں؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں ہوسکا مگر تم عقل سے بہت کچھ سمجھ سکتی ہو یاد رکھو بھول سے بھی اکبر کی یہاں موجودگی کا اعتراف نہ کرنا۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں خواتین کے درمیان آگئیں۔ خواتین بیگم عنایت مرحومہ کی خوبیاں بیان کرکے ان کی ناگہانی موت پر افسوس کر رہی تھیں۔ فیروزہ اور سلمٰی کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں لیکن فیروزہ کے دماغ میں سنسنی سی پیدا ہوگئی تھی۔ عقل کہہ رہی تھی کہ ماں رات کو پہرا دے رہی تھی۔ اس نے اکبر کو دیکھ لیا تھا۔ پھر بات بڑھ گئی ہوگی اور اکبر نے ہمیشہ کے لیے ان کی زبان بند کردی ہوگی۔

وہ سوچ رہی تھی "اگر یہی کچھ ہوا ہے تو مجھے ماں کی موت پر ماتم کرنا چاہیے یا عشق کا نوحہ پڑھنا چاہیے؟ میں کس زبان سے اکبر کو اپنی امی کا قاتل کہوں؟ خدا کرے یہ جھوٹ ہو میرا احمقانہ خیال ہو اور قاتل کوئی اور ہو۔"

اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا بالکل گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ خواتین سمجھ رہی تھیں کہ ماں کے غم سے نڈھال ہے اس پر نیم سکتہ سا طاری ہے لیکن اس کے اندر ماں کے صدمے سے زیادہ اکبر کے لیے کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر بہلا رہی تھی کہ اسے جی جان سے پیار کرنے والا اکبر اس کی ماں کو قتل نہیں کرسکتا۔ وہ تو ماں کے اطمینان کے لیے کسی دن بھی برات لانے اور مجھے بیاہ کر لے جانے کا ارادہ کرچکا تھا۔ ایسا محبت کرنے والا جانی دشمن نہیں ہوسکتا۔

سلمٰی نے دوبار فون کے ذریعے اکبر سے رابطہ کرنا چاہا۔ پتا چلا وہ اپنی کوٹھی میں نہیں ہیں۔ چودھری عنایت حسین نے تھانے سے واپس آکر بتایا کہ اکبر اور جواد پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے رکے ہوئے ہیں۔ وہ جلد ہی لاش لے کر گھر آئیں گے۔ فیروزہ کو باپ کی زبان سے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ اکبر گھر کے فرد کی طرح اس کی امی کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔

چودھری عنایت حسین نے تھانے میں اعتراف کیا تھا کہ لاش کے پاس پایا جانے والا پستول اپنا ہے۔ وہ حیران تھے کہ بیگم رات کو پستول لے کر پچھلی گلی میں کیوں گئی تھیں؟ کسے قتل کرنا چاہتی تھیں؟ اور کس کمبخت کے ہاتھوں ماری گئی تھیں؟ جواد کے پاس بھی ان سوالات کے جواب نہیں تھے۔ پولیس والے بھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کوٹھی کے احاطے سے پچھلی گلی تک صبح ہوتے ہی اتنی بھیڑ لگ گئی تھی کہ قاتل کے قدموں کے نشانات نہیں مل سکتے تھے۔

بیگم کی موت کے بعد گھر میں چند روز تک ماتمی ماحول رہا۔ دور و نزدیک کے رشتے دار

پرسے کے لیے آتے جاتے رہے۔ چودھری اکبر کی آمدورفت کچھ زیادہ ہوگئی۔ اب اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ جب چودھری عنایت حسین شو روم جاتے تھے اور جواد منگلا چلا جاتا تھا تو اکبر وہاں آکر تمام دن فیروزہ کے کمرے میں گھسا رہتا تھا۔

ابتدا میں فیروزہ اپنے محبوب سے کتراتی رہی۔ اکبر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تمہیں اپنی امی کی موت کا بے حد صدمہ ہے مگر مرنے والوں کا ماتم تمام عمر نہیں کرتے۔ ان کا دکھ ان کی یادیں دل میں چھپا کر رکھتے ہیں۔"

فیروزہ نے کہا۔ "میرا دل تمہارے پاس آنے کو مچلتا ہے مگر کوئی بات مجھے روکتی ہے۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"میں سوچتی ہوں امی کے قاتل کا سراغ کیوں نہیں مل رہا ہے۔"

"اس لیے کہ قاتل نے اپنے پیچھے کوئی ثبوت، کوئی پہچان نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے باوجود پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"کسی نام و نشان کے بغیر کیسے تلاش کر رہے ہیں؟"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ابا جان نے بتایا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق رات کے پچھلے پہر تین اور چار بجے کے درمیان قتل ہوا ہے اور پولیس والے ہم سے یہ سوال کرچکے ہیں کہ اس وقت ہمارے ہاں کوئی ملنے آیا تھا یا نہیں؟ اور ہم سب کا جواب ہے کوئی نہیں آیا تھا۔ جبکہ تم موجود تھے۔"

"کیا تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا ہے میں تم پر شبہ نہیں کرنا چاہتی ہوں اس کے باوجود مشکوک سے لگتے ہو۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "بہت دنوں سے میری محبت کی خوراک تمہیں نہیں ملی ہے اس لیے بہک رہی ہو آؤ میں تمہارے دل کا سارا میل دھو ڈالوں گا۔"

وہ کسمانے لگی۔ "نہیں مجھے چھوڑ دو۔"

"آخر کیوں؟"

"بس بہت ہوچکا۔ اب یہ نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے شادی کرو۔"

"میری جان! شادی بھی ہوجائے گی۔"

"آخر کب ہوگی؟"

"ذرا عقل سے سوچو۔ چالیس دن سے پہلے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو چالیس دنوں تک یہ بھی نہیں ہونا چاہیے جو تم چاہتے ہو۔"

وہ خود کو چھڑا کر الگ ہوگئی۔ حسن انکار کرے تو شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ چودھری اکبر

نے اس کا بھرپور سراپا دیکھا۔ سیاہ ماتمی لباس میں اس کی گوری اور گلابی رنگت آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھی۔ آہ وزاری کے بعد سوجی ہوئی آنکھیں اور افسردہ چہرہ ہمدردی اور محبت کے لیے پکار رہا تھا۔

اس نے ہمدردی اور محبت سے ہاتھ بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ ہم محبت میں اندھے ہو کر گناہ کرتے رہے۔ اتنی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میری یہ گمراہی امی کو مار رہی ہے۔ اکبر! میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں نے اور تم نے مل کر امی کو قتل کیا ہے۔"

اکبر نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ نظریں چراتے ہوئے کہا "تم خواہ مخواہ جذباتی ہو کر ایسا سوچ رہی ہو۔ اپنے دماغ سے یہ منفی خیال نکالو ورنہ صدمات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔"

"میں کیا کروں؟ جب تنہا رہتی ہوں تو ایسے ہی خیالات مجھے پریشان کرتے ہیں۔"

"اسی لیے ہم تمہیں تنہا چھوڑتے۔ میں اور سلمٰی باری باری تمہاری تنہائی دور کرتے ہیں۔"

وہ پھر پلٹ کر قریب آیا اور بولا۔ "میری بات مانو لوگ مرنے والوں کے لیے صبر کرتے ہیں اور نئے طور سے زندہ رہنے کے جتن کرتے ہیں۔ تم خود کو میری محبت میں گم کردو۔ نیند آئے تو میرے سینے سے لگ کر سو جاؤ۔ ماں کی یاد آئے تو میری قربتوں میں کھو جاؤ۔ اس لیے کہ تم اگلی تمام زندگی میرے ساتھ گزارنے والی ہو۔"

اس نے پھر اسے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ رونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے آنسو پونچھنے کے لیے رومال مل گیا ہو۔ چودھری نے گلاب سے چہرے کو اٹھایا پھر جھک کر ہونٹوں کے رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔ اسے ہمدردی ملنے لگی۔

ہمدردی کے معنی ہیں کسی کے درد میں شریک ہونا۔

شرکت کا انسانی اصول یہ ہے کہ ہم تمہارا درد دور کرتے ہیں تم ہماری بے چینی دور کرو۔

گویا درد سے بھی منافع کمایا جاتا ہے۔

وہ جو گلے لگا کر درد بانٹنے آتے ہیں بڑے وہ ہوتے ہیں۔ خود بھی درد ہی درد ہوتے ہیں۔

وہ لذت درد سے آشنا تھی مگر اس حقیقت سے ناآشنا تھی کہ جسے یہ لذت لگ جائے وہ غم نصیب ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنا نصیب اس کے نام لکھتی جارہی تھی اور قسمیں لیتی جارہی تھی کہ چالیس دن پورے ہونے کے بعد وہ اس کے باپ کے پاس رشتہ مانگنے آئے گا۔

اس نے چالیس دن کے بعد کہا "لاہور میں میرا ایک مقدمہ زیر سماعت ہے۔ میں پیشی بھگتنے جارہا ہوں۔ ایک ہفتے میں واپس آؤں گا تو تمہارے ابا سے تمہیں مانگ لوں گا۔"

وہ باپ بیٹے کسی کو کسی بھی معاملے میں ٹالنا چاہتے تھے تو کسی مقدمے میں مصروف اور پریشان رہنے کا بہانہ کرتے تھے۔ چودھری اکبر بھی اسی بہانے لاہور میں مجرا سننے آگیا۔ آخر جاگیردار زادہ تھا۔ نہ کوئی کاروباری پریشانیاں تھیں نہ بیوی بچوں کی فکر تھی۔ وقت اتنا ہوتا تھا کہ گزرتا نہیں تھا۔ دولت اتنی تھی کہ خرچ ہوتے ہوتے بھی ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ اس لیے معیاری عیاشی میں وقت گزرتا تھا۔ یعنی عیاشی کا معیار یہ تھا کہ بازار والیوں کو منہ نہیں لگاتا تھا صرف مجرا سنتا تھا۔ شریف زادیوں کو منہ لگاتا تھا مگر گلے کا پھندا نہیں بناتا تھا۔

اب وہ کچھ تشویش میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ فیروزہ کو نظرانداز کرے۔ جتنی لوٹ مار کرنی تھی کرچکے۔ اب کچھ نہیں رہا لیکن کچھ رہ گیا تھا۔ وہ اس سے کترانے کا ارادہ کرتا تھا پھر اس البیلی حسینہ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔

حسن تو دنیا میں بکھرا پڑا ہے حسین عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ چودھری نگر نگر گھوم چکا تھا مگر جانے کیوں فیروزہ اس کی ضرورت بن گئی تھی۔ اس میں کوئی بات کوئی کشش دوسروں سے مختلف تھی جو اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ لوٹنے آتا تھا لیکن اداؤں کی گرم بازاری میں لٹ کر چلا جاتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس رات اس کی ماں کو ہلاک نہ کرتا پستول کی گولی سے بچ گیا تھا اس اطمینان سے گھر چلا جاتا کہ ماں بیٹی کی عزت رکھنے کے لیے شور نہیں مچائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرے گی کہ اپنے ہاں اس کا داخلہ بند کردے گی۔ اپنی بیٹی سے ملنے نہیں دے گی۔ بس وہ یہی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے درمیانی دیوار گرادی تھی۔ پھر پچھتاتا بھی رہا کہ کیوں گرادی۔ وہ بڑھیا ہوتی تو اسی کی سختی اور پہرے داری کے بہانے فیروزہ سے دور ہوجاتا۔ وہ پہلے کبھی ایسی دوغلی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس سے دوری بھی چاہتا تھا اور اسے دیوانے کی طرح مانگتا بھی تھا اس کے ساتھ کبھی بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا اور اس کی خاطر ایک نہیں کئی قتل بھی کرسکتا تھا۔

اس نے لاہور آکر اسے بھلانے کی کوشش کی۔ بھلانے کے لیے کتنی ہی حسینائیں تھیں لیکن سمندر کا جھاگ تھیں۔ ہوس کے بجھتے ہی ان کی ضرورت بھی بجھ جاتی تھی۔ ان کے بعد فیروزہ ہی کی آنچ آتی رہتی تھی۔ بعض عورتیں ہوس اور گناہ سے بالاتر ہو کر غیر محسوس طریقوں سے متاثر کرتی ہیں۔ یہ بات چودھری کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے کسی طرح دو ماہ وہاں گزار دیے۔ پھر ایک دن مجبور ہو کر اسے فون کیا دوسری طرف سے سلمٰی کی آواز آئی۔ اس نے کہا "میں اکبر بول رہا ہوں۔"

"اوہ اکبر! تم کہاں غائب ہوگئے ہو یہ فیروزہ تمہارے لیے روتی رہتی ہے۔"

فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ "بھابی! مجھے دو میں بات کروں گی۔"

پھر اس نے سلمیٰ سے ریسیور لے کر کہا "ہیلو اکبر! کیا آج ہماری یاد آئی ہے؟ کیا خوب وفا کر رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "تم مجھے خوب طعنے دینا۔ پہلے میری مجبوری سن لو۔ مقدمہ اتنا پیچیدہ ہوگیا تھا کہ جیل جانے کی نوبت آگئی تھی۔"

"یہاں میرے مرنے کی نوبت آگئی ہے میں ماں بننے والی ہوں۔"

"کیا؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

"پریشانی کی کیا بات ہے بچہ ڈراپ کردو۔"

"کیا کردو؟"

"بھئی ڈراپ کردو۔ اسے دنیا میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں سلمیٰ سے کہتا ہوں۔ وہ نوٹ پھینکے گی تو سارے کام آسان ہوجائیں گے۔"

"میں بھی نوٹ پھینکنا جانتی ہوں مگر بچہ نہیں پھینکوں گی۔ تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ یہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ فوراً آکر مجھ سے نکاح پڑھواؤ۔ بدنامی کے تمام اندیشے ختم ہوجائیں گے۔"

"میری جان! فون پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔ ایک بچہ ختم ہوگا تو محبت ختم نہیں ہوگی۔ آئندہ بھی تالاب میں پانی آتا رہے گا اور مچھلیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔"

"اکبر! مجھے غصہ آرہا ہے۔ میں سوچ رہی تھی تم باپ بننے کی خوشخبری سے ہی دوڑے چلے آؤ گے۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "فیروزہ! غصے میں آواز پر قابو رکھو۔ اگر ابا جان نے..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر کمرے سے باہر جاکر دیکھنا چاہا کہ سسر صاحب اپنے کمرے میں ہیں یا نہیں لیکن دروازے کی طرف پلٹتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ چودھری عنایت حسین دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑے بہو کی چوکھٹ پر پڑے تھے اور بری طرح لرز رہے تھے۔ یہ تیسری بار ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔

فیروزہ پہلے تو بھید کھلنے پر سہم گئی تھی پھر باپ کی حالت دیکھتے ہی فون پر چیخ کر کہا۔ "اکبر! جلدی آؤ۔ ابا جان پر پھر دورہ پڑا ہے۔ ہم انہیں ہسپتال لے جارہے ہیں۔"

پھر وہ رابطہ ختم کرکے ایمبولینس کے لیے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ سلمیٰ دوڑتی ہوئی جواد کو آوازیں دیتی ہوئی کمرے سے جاچکی تھی۔ بیٹی نے ایمبولینس کی بات کرکے ریسیور کو رکھا۔ پھر دوڑتی ہوئی باپ کے پاس آئی وہ بہو اور بیٹی کی بے حیا دہلیز پر پڑا ہوا دیدے پھیلائے دیکھ رہا تھا۔ بیٹی نے جھک کر اسے سہارا دینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے اس نے

ایک جھٹکے سے پیچھے ہونا چاہا۔ مگر کمزوری سے بس تھرتھراتا رہ گیا۔ منہ سے "ہونہہ ہونہہ" کی آواز نکلی صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ان ناپاک ہاتھوں سے دور ہونا چاہتا ہے۔

وہ بڑی ندامت اور پشیمانی سے بولی۔ "ابا جان!"

اس سے آگے نہ بول سکی۔ ابا جان نے ایک آخری جواب دیا۔ تھرتھراتے ہوئے اس کی طرف منہ کرکے تھوکا۔ آخری سانسوں میں تھوک صحیح طرح نہیں نکلا۔ ہونٹوں سے ابل کر باچھوں سے رسنے لگا۔ دیدے پھیل گئے تھے۔ گردن ڈھلک گئی تھی۔ سانسیں تمام ہوگئی تھیں۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی باپ سے لپٹ گئی۔

کون نہیں مرتا؟ سب ہی کے باپ مرتے ہیں۔ لیکن ایسے کم نصیب باپ کم کم ہوتے ہیں، جن کے منہ پر بیٹی تھوک بن کر پھیل جاتی ہے۔ وہ تھوک ان کی باچھوں سے رستا ہوا مردہ چہرے پر پھیلتا جارہا تھا۔

وہ یکبارگی چیخ مار کر اٹھی۔ "امی!"

پھر وہ دوڑتی ہوئی راہداری میں آئی۔ "امی! امی جلدی آئیں۔ کہاں ہیں آپ؟ جلدی آئیں..."

ادھر سے سلمیٰ اور جواد آرہے تھے جواد نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کہاں بھاگی جارہی ہو؟"

"بھائی جان! امی کو بلانے جارہی ہوں ابا جان فوت ہوگئے۔"

وہ پھر امی امی پکارتی ہوئی جانا چاہتی تھی، بھائی نے اسے پکڑ لیا۔ بھابی نے کہا "ہوش میں آؤ۔ امی اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"آں؟" اس نے چونک کر بھابی کو پھر بھائی کو دیکھا وہ دونوں اسے ساتھ لے کر چودھری عنایت حسین کی لاش کے پاس آئے بیٹا باپ کو مردہ دیکھتے ہی پاس آکر فرش پر دوزانوں ہوگیا۔ سر جھکا کر رونے لگا۔

اسے روتے دیکھ کر فیروزہ یکبارگی ہنسنے لگی۔ سلمیٰ نے اسے تعجب سے دیکھا وہ آگے پیچھے ڈگمگاتی ہوئی ہنستی جارہی تھی۔ سلمیٰ نے اسے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوگیا ہے تجھے؟"

وہ بدستور ہنستی ہوئی بولی۔ "ابا جان کے مرتے ہی مجھے امی کا خیال آیا کہ وہی ایک ایسی ہیں جو میرے باپ کی میت پر روئیں گی۔ میں تو باپ کی قاتل ہوں۔ مجھے رونے اور ماتم کرنے کا حق نہیں ہے اسی لیے میں امی کو پکار رہی تھی۔ بھائی جان تو آپ کے سگنل پر ہنستے ہیں اور آپ کے سگنل پر روتے ہیں۔ مگر دیکھو دیکھو یہ ہنسنے کی بات ہے یا نہیں؟ یہ پہلی بار آپ کی اجازت کے بغیر رونے کی غلطی کر رہے ہیں۔"

سلمیٰ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ نند سہیلی آج طعنے دے رہی ہے یا باپ کی موت سے ذہنی توازن بگڑ رہا ہے؟

وہ دوسرا خیال درست تھا۔ کوئی سوا تین ماہ پہلے ماں کو قتل کیا گیا اور آج باپ بھی

گیا۔ اس کے ذہن پر برا اثر پڑا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے چکرا کر گر پڑی پھر اسے ہوش نہ رہا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنے کمرے میں اپنے بستر پر تھی۔ کمرے کے باہر کچھ عورتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک عورت کی آواز آئی وہ کہہ رہی تھی "میت اٹھنے والی ہے بیٹی اپنے باپ کا آخری دیدار کر لیتی تو اچھا ہوتا۔"

دوسری آواز سنائی دی۔ "مگر یہ تو ابھی تک بیہوش ہے۔"

پھر دور سے سلمٰی کی آواز آئی وہ پوچھتی آ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ فیروزہ کو ہوش آیا؟"

"نہیں یہ ابھی تک ایسی ہی پڑی ہے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "ڈاکٹر کہہ رہا تھا دو چار گھنٹے میں ہوش آ جائے گا' یہاں تو چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ پلیز آپ سب یہاں سے چلیں۔ اسے تنہا چھوڑ دیں۔"

فیروزہ نے بند آنکھوں کے پیچھے سے اندازہ لگایا۔ جانے والوں کی کچھ آہٹیں سنیں۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے سن لیا تھا کہ گھر سے باپ کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ ابا جان کو آخری بار دیکھ لینے کو دل تڑپنے لگا تھا مگر اپنے آپ پر بھروسا نہیں تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ احساسِ جرم سے پھر ذہنی رو بہک جائے گی اور وہ جنون میں سچائیاں اگلنے لگے گی۔

وہ بڑے دکھ سے سوچنے لگی۔ "آہ! یہ کیا ہوگیا؟ میں نے اور اکبر نے محبت کو گناہ بنایا اور امی ابا جان کی موت نے اس محبت کو جرم بنا دیا ہے۔ میں اندھی کیوں ہوگئی تھی؟ یہ احساسِ جرم پہلے کیوں نہ ہوا؟"

کسی بے عقل کو اچانک عقل نہیں آتی۔ اس کے احساس کے جاگنے اور ضمیر کے چونکنے کی وجوہات کبھی سمجھ میں آتی ہیں کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ دراصل پہلے فیروزہ کا نہیں ایک ماں کا ضمیر اس وقت جاگا تھا جب فون پر اکبر نے کہا تھا بچے کو ضائع کر دو۔

تب پتا چلا اولاد کیا ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوا کہ اس کی امی اسے رسوائی سے بچانے اس کی آبرومندی اور نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے کیسی باؤلی ہو رہی تھیں۔ اس ماں نے اس کے پیٹ میں آنے والے بچے کو روکنے کیلیے پہرا دیتے دیتے اپنی جان دے دی اور جب جان دے دی اور جب بچے نے اپنی آمد کی خبر دیدی ہے تو یار کا حکم ہوتا ہے بچے کو مار ڈالو۔

"کیسے مار ڈالوں؟" وہ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر زیرِ لب بڑبڑائی۔ "میں اس ماں کی بیٹی ہوں جس نے مجھے عزت سے زندہ رکھنے کے لیے جان دی۔ میں بھی اپنی اولاد کو دنیا میں لاؤں گی اور اسے زندہ رکھوں گی۔"

دیکھا جائے تو گناہ کے ثمر کو قائم رکھنے کا عزم احمقانہ تھا گناہ چھپایا جاتا ہے نہ چھپ

سکے تو اس کی نشانی مٹا دی جاتی ہے۔ لیکن کوئی ہوشمند اور کوئی عالم فاضل اس بچے کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دے گا جو کوکھ میں اپنے وجود کا اعلان کر چکا ہو۔

ایسے بچے کو مطعون نہیں کیا جاتا بلکہ معصوم اور بے گناہ کہا جاتا ہے۔ البتہ اس کی پیدائش کے ذمہ دار گناہگاروں کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔

ابھی وہ دین اور فتاوٰی کے پہلوؤں سے نہیں سوچ رہی تھی۔ ابھی تو اس کے اندر بارودی دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ اس منظر کو بھلا نہیں پا رہی تھی جب باپ نے مرتے مرتے اس پر تھوکا تھا۔ ندامت اور پچھتاوے سے اس کا دماغ پھٹ پڑنا چاہتا تھا مگر وہ ذہن کو قابو میں رکھنے کی پوری کوششیں کر رہی تھی۔ اس کے متعلق ماں باپ اور بھائی کی متفقہ رائے یہی ہوا کرتی تھی کہ وہ ضدی اور خود سر اور ارادے کی پکی ہے جو سوچ لیتی ہے وہ کر گزرتی ہے اسی قوت ارادی سے وہ خود کو نارمل رکھنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ سلمٰی ایک ڈاکٹر کے ساتھ اندر آئی۔ فیروزہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "سلمٰی بیٹی تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔ ہماری فیروزہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں ہوش میں ہوں۔ آپ بھی ہوش میں رہیں ڈاکٹر صاحب! اس گھر میں ماتم ہو رہا ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں۔"

وہ ایک دم سے جھینپ کر سنجیدگی سے بولا۔ "سوری ہم ڈاکٹر اپنے مریضوں سے مسکرا کر بولتے ہیں۔ میں تمہیں ہوش میں دیکھ کر چند لمحوں کے لیے یہاں کے ماتمی ماحول کو بھول گیا تھا۔ سو سوری۔"

اس نے نبض تھامنے کیلیے ہاتھ بڑھایا وہ بولی "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے اس کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کا شکریہ۔"

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ کچھ عورتیں اندر آگئیں۔ سلمٰی نے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے تم نے ڈاکٹر کو بھگا دیا۔ وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔"

"آج سے میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ دنیا کیا سوچے گی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

ایک خاتون نے کہا "ہاں بیٹی! اب تو والدین کا سایہ نہ رہا تمہیں اپنا اچھا برا خود سوچنا اور سمجھنا چاہیے۔"

دوسری نے سلمٰی کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ "اپنی فیروزہ تو خوش نصیب ہے کہ ایسی پیار کرنے والی بھابی ملی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سلمٰی بھابی اسے والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔"

فیروزہ نے کہا "میں بھی آئندہ بھابی کو ساس کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔"

سلمٰی نے واضح طور سے محسوس کیا کہ آج نند سہیلی کے پیچھے ساس بول رہی ہے۔ باپ کے مرتے ہی فیروزہ کے تیور بدل گئے ہیں۔ ویسے سلمٰی اندر سے بہت مطمئن اور بہت خوش تھی گھر کے دو قد آور پہاڑ گر چکے تھے۔ اب اس گھر کا اور دولت و جائداد کا مختار کل جواد ہو چکا تھا اور جواد کی مختار کل وہ خود تھی۔ اسے دولت جاگیر اور وہاں کی حکمرانی اچانک ہی مل گئی تھی۔

جواد آخری رسومات ادا کرکے قبرستان سے آگیا۔ تعزیت کو آنے والے رفتہ رفتہ رخصت ہوگئے۔ پنڈی اور لاہور سے آنے والے رشتے دار سوم تک وہاں رہنے آئے تھے۔ رات ہوتے ہی فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا تاکہ کمرے میں کوئی نہ آئے۔ ایک آدھ بار دستک سنائی دی۔ اس نے جواب دیا نہ دروازہ کھولا۔ یہی تاثر دیتی رہی کہ سو رہی ہے۔

وہ سونے والی بات نہیں تھی۔ آج باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ سونا بھی چاہتی تو نیند نہ آتی۔ دل چاہتا تھا اکبر آجائے اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے سے دکھ کم ہوگا اور یہ استحکام حاصل ہوگا کہ والدین کے بعد سب سے مضبوط سہارا اپنا مرد ہی ہوتا ہے۔

اگرچہ اس بات کا غصہ تھا کہ وہ بچے کے لیے دشمن کے لہجے میں بول رہا تھا لیکن بولنے سے کیا ہوتا ہے؟ مرد غصہ دکھاتا ہے گالیاں دیتا ہے۔ کبھی مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی دیتا ہے مگر کلیجے سے لگا کر پیار بھی تو کرتا ہے۔ وہ محبت سے سوچ رہی تھی کہ وہ آئے گا تو اسے اپنی طرح بچے سے بھی محبت کرنا سکھادے گی اور اس بات کا پورا یقین تھا کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد اکبر اسے بے یارومددگار دیکھ کر آتے ہی نکاح پڑھالے گا۔

آدھی رات کے بعد اس نے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈ نکالا۔ والدین کی جدائی کا صدمہ دور کرنے اور ذہنی انتشار سے محفوظ رہنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اکبر کی یادوں میں پناہ لیتی رہے اور اس کی آواز سنتی رہے۔

اس کے پاس دس کیسٹ ایسے تھے جن میں اکبر کی اور اس کی اپنی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ جب وہ بند کمرے میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے آتا تھا۔ وہ اس کی آمد سے پہلے کیسٹ ریکارڈر چھپا کر رکھتی تھی۔ اگر وہ اکبر سے کہتی کہ محبت کی یادگار ملاقاتوں کو ریکارڈ کر رہی ہے تو وہ بھی دلچسپی لیتا اور بعد میں وہ آوازیں سنتا لیکن عورت کی فطرت ہے وہ بعد میں ایسی باتوں سے اور جذباتی آوازوں سے شرماتی ہے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا محبوب بھی گزری ہوئی رومانی اور جذباتی ملاقاتوں کی روداد سنے۔ اس لیے اس نے ان آوازوں کو اس سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

وہ کانوں سے ائر فون لگا کر بستر پر لیٹ گئی۔ ریکارڈر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ پھر بٹن کو دبایا چند ساعتوں تک خاموشی رہی وہ اکبر سے دوسری ملاقات والا کیسٹ تھا۔ اس رات

ہونے والی بارش کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بارش اور بادلوں کی گرج کے پس منظر میں اکبر کی واضح آواز ابھرنے لگی۔ "میری جان! اس طوفانی بارش نے میرا راستہ روکنے کی بہت کوششیں کیں مگر تمہارا دیوانہ کسی کے روکنے سے رکنے والا نہیں ہے۔ آندھی طوفان سے لڑ کر آیا ہوں آؤ مجھے انعام دو۔"

فیروزہ نے ریکارڈ سے ابھرنے والی اپنی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہاری یہی دیوانگی مجھے دنیا سے بیگانہ کردیتی ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ آج میں نے تمہاری خاطر امی سے بھی گستاخی کی ہے ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ لباس تو بدلو سر سے پیر تک پانی سے بھیگے ہوئے ہو کیا مجھے بھی بھگونا چاہتے ہو۔"

"مجبوری ہے۔ جذبات کی بارش میں اپنے ساتھی کے ساتھ بھیگنا ہی پڑتا ہے۔"

"جی نہیں۔ میں نے موسم کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ کس حال میں آؤگے اس لیے بھائی سے بھائی جان کی ایک دھوتی مانگ لائی ہوں۔ یہ لو اور اسے پہن لو۔"

اس کے بعد ریکارڈ خاموش ہوگیا۔ حالانکہ وہ آن تھا اور کیسٹ اپنی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ خاموشی اسی لیے تھی کہ وہ لباس بدل رہا تھا اور وہ منہ گھما کر پلنگ کے پاس آگئی تھی۔ بستر کے سرہانے بھی ایک چھوٹا ریکارڈ چھپا ہوا تھا۔ اس کمرے میں تین مختلف جگہوں پر ریکارڈنگ جاری تھی۔ وہ محدود چاردیواری میں جہاں بھی اس کے ساتھ وقت گزارتی رہی وہاں کی یادیں ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہوتی رہیں۔

وہ سنگدل لاہور گیا تھا۔ دو ماہ گزر چکے تھے اور واپس نہیں آیا تھا۔ ایسی جدائی کی راتوں میں وہ جاگتی رہتی تھی۔ پھر کمرے میں گھپ اندھیرا کرنے کے بعد اس کی یادوں اور آوازوں سے ملاقات کرتی رہتی تھی۔

جب اس کی آواز ابھرتی تو وہ اندھیرے میں صاف نظر آنے لگتا تھا۔ جو ریکارڈ بولتا تھا وہی خود بولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھاتی تھی مگر اسے چھو نہیں سکتی تھی۔ وہ پہلو میں ہوتا تھا مگر پہلو نہیں بھرتا تھا۔ وہ خالی رہ جاتی تھی۔ اندھیرے میں یہ آدھی ملاقات اندھیر کرتی رہتی تھی۔

پھر پتا نہیں وہ ڈیڑھ گھنٹے کا کیسٹ چلتے چلتے کب ختم جاتا تھا۔ اس کی یادیں اور اس کی ضرورتیں تھمنے کو نہیں آتی تھیں۔ صبح تک شور مچاتی رہتی تھیں۔

دوسرے شہروں سے آنے والے رشتے دار تین دنوں تک وہاں رہ کر رخصت ہوگئے۔ کوٹھی میں اب سلمٰی اور جواد کو اپنی طبعی عمر تک رہنا تھا۔ فیروزہ کے لیے وہ کوٹھی چڑیاں دا چنبہ تھی۔ سلمٰی سوچ رہی تھی "یہ بھی یہاں سے اڑ جائے تو اچھا ہے۔ اب اس کی عزت کیا رہی ہے کہ میرا بھائی اسے اپنے خاندان کی عزت بنائے گا اور اس سے اپنی نسل پیدا کرائے گا۔ اس لیے فون پر بچے کو ختم کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اب وہ یہاں آئے گا تو میں اس سے آخری فیصلہ سنوں گی۔ وہ اسے داشتہ بنا کر لے جائے یا میں کسی سے بھی اس کا

نکاح پڑھوا کر اپنے گھر سے دور کروں گی۔"

اکبر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی فیروزہ پھٹ پڑی۔ غصے سے بولی "تم مجھ سے منہ کیوں چھپا رہے ہو؟ صاف صاف کہتے کیوں نہیں کہ دل میں کیا ہے؟"

اکبر دو ماہ بعد فیروزہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دل نشین لگ رہی تھی۔ وہ اتنے عرصے لاہور میں رہ کر اس کی طلب سے باز نہ آسکا تھا۔ روبرو آکر اس کا اور ضرورت مند بن گیا۔ اس نے کہا "فیروزہ میں منہ چھپانے والا بزدل نہیں ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ مقدمہ کی ولدل میں دھنستا جارہا ہوں اور تم سے مل نہیں پارہا ہوں تو رشوتیں دے کر پیشی کی لمبی تاریخ لے کر آرہا ہوں۔"

سلمٰی نے کہا "اکبر تم باپ بیٹے ایک مقدمہ سے نکلتے ہو اور دوسرے میں الجھتے ہو۔ یہ سلسلہ تو ساری زندگی جاری رہے گا۔ یہاں آئے ہو تو آخری فیصلہ کرو۔ میں فیروزہ کو اور بٹھا کر نہیں رکھوں گی۔ تم دیر کروگے تو میں اسے دوسری جگہ بیاہ دوں گی۔"

فیروزہ نے گھور کر پوچھا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ آپ جانتی ہیں میرے بچے کا باپ سامنے کھڑا ہے۔ پھر بھی کسی دوسرے سے میری شادی کا ارادہ کر رہی ہیں۔ کیا میں گھر میں بندھی ہوئی بھینس ہوں کہ رسا کھول کر جس کے ہاتھ میں چاہوگی مجھے تھما دو گی۔"

وہ بولی "میں ایک ہی بات جانتی ہوں کہ تمہارے ماں باپ کے بعد اس خاندان کی عزت اور شرافت کو قائم رکھنے کی ذمے داری میری ہے۔ اگر تم دونوں نے جلد ہی شادی نہ کی تو میں اپنے گھر میں ناجائز بچے کو پیدا نہیں ہونے دوں گی۔"

"آپا! تم تو گھر کی مالکن بن کر پٹانے کی طرح بولنے لگی ہو۔ آخر کیوں نہیں بولوگی؟ کروڑوں کی جائداد کی مالکہ بن چکی ہو۔ مجھے اور فیروزہ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکنا چاہتی ہو۔ اب تم میں پہلی جیسی محبت اور مروت نہیں رہی۔"

"اتنی باتیں نہ کرو اکبر! دوٹوک فیصلہ سناؤ شادی اور اس بچے کا کیا ہوگا؟ تم نے کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"ہاں سوچا ہے۔ مجھے اپنی فیروزہ پر پورا بھروسا ہے میں جو کہوں گا یہ مان لے گی۔ کل تک بچے سے نجات حاصل کرلے گی۔"

فیروزہ تڑپ کر بولی "ہرگز نہیں۔ مجھ پر ایسا بھروسہ نہ کرنا۔فوراً" شادی کروگے تو ہماری محبت کو جائز منزل ملے گی بچے کو مارنا چاہوگے تو محبت گناہ بن جائے گی۔"

"گناہ اور ثواب کے چکر میں نہ پڑو۔ دنیا والے ہم پر تھوکیں گے۔"

"ابا جان نے جس طرح مجھ پر تھوکا تھا اس طرح پوری دنیا نہیں تھوک سکے گی۔ میں رسوائی اور ذلت کی حد سے آگے نکل آئی ہوں۔ یہ بچہ سلامت رہے گا تم آج شام تک نکاح پڑھالو۔"

وہ بولا "شادی صرف ہمارا نہیں پورے خاندان کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل

نہیں ہے۔"

"یہ بچے کا ہی کھیل ہے۔ بچے کو میری اور تمہاری گود میں کھیلنے کا حق نہ ملا تو میری محبت تمہارے لیے مصیبت بن جائے گی۔"

"فیروزہ! مرد دھمکی نہیں سنتا۔ اس لیے ایک عورت کی حد میں رہ کر بات کرو۔"

وہ بولی "عورت تو میں صرف تمہاری محبت میں ہوں۔ ورنہ سیلاب بلا ہوں۔ کل اسی وقت تک نکاح نہ پڑھایا گیا تو میں پرسوں قانون داں خواتین کی انجمن میں جاؤں گی اور تمہیں شرعی عدالت میں بلاؤں گی۔"

دونوں بہن بھائی نے پریشان ہوکر اسے دیکھا۔ پھر اکبر نے کہا۔ "یہ کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔ کچھ جانتی بھی ہو شرعی عدالت میں ہم دونوں گناہ گار ٹھہرائے جائیں گے اور ہم دونوں کو سزائے موت دی جائے گی۔"

"جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارے بچے کو قانونی تحفظ ملے گا۔ اسے معصوم تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ہمارے گناہ کا محرک نہیں ہے۔ ہم اس کی پیدائش کے محرک ہیں۔"

سلمٰی نے کہا "کیا پاگل ہوگئی ہو ساری دنیا میں رسوا اور ذلیل ہوکر سزائے موت پانا چاہتی ہو۔"

"میں عزت سے جیوں گی تو اکبر کے ساتھ۔ ذلت سے مروں گی تو اکبر کے ساتھ۔ میری زندگی کا اول اکبر میری زندگی کا آخر اکبر۔ یہ فیصلہ اکبر چوبیس گھنٹوں کے اندر کرے کہ کیسی زندگی یا کیسی موت چاہتا ہے؟"

وہ وارننگ دے کر وہاں سے جانے لگی۔ وہ بہن بھائی اسے گھور کر دیکھتے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو سلمٰی نے کہا "بات نہ بڑھاؤ اکبر! اس کے کمرے میں جاؤ اور کسی طرح اسے منالو۔"

"میں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ جوڑ کر نہیں منایا۔ جوتیوں کو ہمیشہ پیروں میں پہنا ہے سر پر نہیں رکھا۔ یہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسند ہے اس لیے ذرا نخرے برداشت کرلیتا ہوں لیکن دھمکیاں سننے کے بعد اسے بھی جوتوں کی نوک پر رکھوں گا۔"

"میں جانتی ہوں تم اور ابا لڑنے جھگڑنے میں' خون خرابے میں اور مقدمے بازی میں کتنے زبردست ہو لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ یہ لڑکی کیا بلا ہے؟ اسے محبت سے چاہے جس قدر لوٹ لو لیکن لوٹ مار کا احساس ہونے دوگے تو یہ ڈنکے کی چوٹ پر مصیبت بن جائے گی۔"

"لہٰذا میں اس مصیبت سے گھبرا جاؤں اور اس گھسی پٹی بچہ دینے والی سے شادی کرلوں؟ آپا! تم بھی مجھے غصہ دلا رہی ہو۔ کیا ہمارا خاندان ایسا ہے کہ منہ کالا کرنے والیاں بہو بن کر آسکیں؟ آپ اسے بلا سمجھتی ہیں نا؟ میں اس بلا کی اوقات بتاؤں گا۔ اگر وہ مجھے

بدنام کرنے کی حماقت کرے گی تو اسے بازار میں بٹھادوں گا۔"

وہ غصے میں تنتناتا ہوا چلا گیا۔ فیروزہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر چھپی ہوئی تھی۔ اکبر کی باتوں نے اور رویے نے سمجھا دیا کہ چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے دہشت گرد اور قاتل جاگیرداروں سے فوراً بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہیے۔

سب اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے اور اپنی بہتری کے پیش نظر فیصلہ کر رہے تھے۔ سلمٰی کا آخری فیصلہ تھا کہ اکبر سے سمجھوتا ہو تب بھی اور نہ ہو تب بھی فیروزہ کو گھر سے جانا چاہیے۔ اگر دونوں کے درمیان اسی طرح بات بگڑتی رہی تو وہ بھی ان کے بیچ دلالی کرنے کے الزام میں پھنسے گی۔ اس سے پہلے ہی اپنے دامن کا دھبا دھو ڈالنا چاہیے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر منگلا ڈیم آفس کے نمبر ڈائل کیے رابطہ قائم ہونے پر کسی نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

"میں بیگم جواد حسین بول رہی ہوں۔"

"جی بیگم صاحبہ! ابھی صاحب کو بلاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر جواد کی آواز سنائی دی۔ وہ چاپلوسی کے انداز میں بولا "ہیلو سلمٰی رانی تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو ابھی تم سے بچھڑے ایک گھنٹہ چالیس منٹ ہوئے ہیں اور تم میرے بغیر نہیں رہ سکیں آخر فون پر بلا لیا۔"

"کیا مصیبت ہے آپ بولتے ہیں تو رکتے نہیں ہیں مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع دیں۔"

"ہاں بولو سن رہا ہوں۔"

"ہم نے اس کوٹھی کو پیار کا محل بنایا ہے۔"

"ہاں بنایا ہے۔"

"اس محل میں تین ماہ بعد ہمارا بچہ جنم لینے والا ہے۔"

"بے شک ہم بہت بڑا جشن منائیں گے۔"

"لیکن اس سے پہلے ماتم کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے گھر میں ایک ناجائز بچہ پیدا ہونے والا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟ کیسے پیدا ہونے والا ہے؟ کون پیدا کرنے والی ہے؟"

"تمہاری بہن فیروزہ۔"

وہ غصہ سے گرجنا چاہتا تھا مگر فوراً ہی خیال آیا کہ دفتر میں ہے۔ اس نے دانت پیس کر دبی زبان سے پوچھا "فون پر کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"اگر یہ بکواس ہوتی تو آپ کے گھر آنے کا انتظار کرلیتی لیکن سچائی انتظار نہیں کرتی۔ آپ شام تک آئیں گے تو خاندان کی بدنامی گھر سے باہر نہ جانے کہاں تک پھیل چکی ہوگی۔ آپ فوراً اسی وقت آئیں۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ سلمٰی نے ریسیور رکھ دیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اس خاندان میں بڑا فساد پھیلنے والا ہے۔ فیروزہ اکبر کو نہیں چھوڑے گی اور جواد فیروزہ کو مار پیٹ کر گھر سے نکالے گا اور اگر اکبر کو اپنی بدنامی اور قانونی گرفت میں آنے کا اندیشہ ہوگا تو وہ ماں کی طرح بیٹی کو بھی قتل کردے گا۔

ہر صورت میں سلمٰی کا فائدہ تھا۔ اس گھر سے نند کا کانٹا بھی نکلنے والا تھا۔ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا اس نے ریسیور اٹھاکر کہا "ہیلو۔"

"آپا! میں اکبر بول رہا ہوں۔ ابھی غصہ میں چلا آیا تھا پھر عقل آئی کہ بھائی کو غیرت دلا کر بہن کا بچہ ضائع کرایا جاسکتا ہے۔"

"تمہیں دیر سے عقل آئی۔ میں ابھی یہ غیرت کا انجکشن جواد کو دے چکی ہوں۔ وہ غصہ میں ڈیوٹی چھوڑ کر آرہا ہے۔"

"آپا! تمہارا جواب نہیں ہے۔ آخر ہونا میری بہن بس ایک مہربانی اور کرو۔ جواد بھائی کے سامنے فیروزہ کی یہ بات کبھی تسلیم نہ کرنا کہ بچہ میرا ہے اور میں نے کبھی تنہائی میں فیروزہ سے ملاقات کی ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں کہ تسلیم کرلوں گی۔ ایسا کرنے سے میں بھی پھنسوں گی کیونکہ تم میرے ہی کمرے سے گزر کر اس کے کمرے میں جاتے تھے۔"

"ہمیں پہلے سے طے کرلینا چاہیے کہ جواد بھائی کو کیا کہنا ہے۔ ہم دونوں کے بیان میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ ایک دوسرے کے مشوروں سے ایک مخصوص اور مشترکہ بیان ترتیب دینے لگی۔ دونوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ فیروزہ بچے کی خاطر جذباتی اور جنونی ہو رہی ہے۔ کسی طرح بچہ اس کی زندگی سے نکل جائے گا تو سارا جنون اور جذبے سرد پڑجائیں گے۔

بہن بھائی نے جواد کو متاثر کرنے اور اسے اپنا حمایتی بنائے رکھنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ پھر بھائی نے کہا "میں اپنی کوٹھی میں ہوں جیسے ہی فون پر آنے کے لیے کہو گی میں چلا آؤں گا۔"

ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد جواد آگیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی غصے سے آوازیں دینے لگا "فیروزہ! کہاں ہو فیروزہ! سامنے آؤ۔"

سلمٰی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آکر بولی "آپ اس طرح گلا کیوں پھاڑ رہے ہیں کیا بدنامی کو گھر کے باہر پہنچانا چاہتے ہیں؟"

"تم چپ رہو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرا خون کھول رہا ہے۔"

"اور آپ کا خون میرے پیٹ میں پرورش پارہا ہے۔ آپ بہن کو قتل کرکے پھانسی پر چڑھ جائیں گے تو میرا اور میرے بچے کا کیا ہوگا۔"

وہ ذرا نرم پڑگیا وہ بولی "کسی گناہگار کو مار کر سزائے موت پانا اپنے بیوی بچے اور اپنا گھر برباد کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"آپ عقل سے کام لیں اور بدنامی کو باہر پھیلنے سے پہلے ختم کردیں۔ بات ابھی گھر کی چاردیواری میں ہے۔ بچہ ختم ہو گا تو ذلت اور رسوائی کے تمام اندیشے ختم ہوجائیں گے۔"

"آخر یہ کس شیطان کا بچہ ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ وہ ہمیں اور ہمارے خاندان پر کیچڑ اچھال رہی ہے میرے بے گناہ بھائی کو الزام دے رہی ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ الزام ہے۔ تمہارا بھائی کوئی معصوم فرشتہ نہیں ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ وہ فیروزہ کو پسند کرتا ہے اور تم اسے بھابی بنانا چاہتی ہو۔"

"آپ کی بہن کو پسند کرنے اور اس کا رشتہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نیت میں نیکی اور محبت ہے۔ گناہ کرنے والے رشتہ نہیں مانگتے۔ پھر میرا بھائی ایسی غلطی کیوں کرتا جبکہ آپ کی والدہ مرحومہ بھی اسے داماد بنانے کے لیے راضی تھیں؟"

وہ ٹھوس دلائل سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔ سلمیٰ نے پاس بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اب یہ گھر میرا ہے میں اس خاندان کے وارثوں کو پیدا کرتی رہوں گی۔ اس لیے خاندان کی عزت رکھنے کی خاطر اس حالت میں بھی فیروزہ کو بھابی بناؤں گی۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ احسان مندی سے بیوی کو دیکھا پھر پوچھا "کیا اکبر اسے گناہ سمیت قبول کرلے گا؟"

"میں بڑی بہن ہوں' وہ میرا حکم نہیں ٹالے گا۔ آپ کو صرف بہنوئی نہیں بڑا بھائی سمجھتا ہے آپ کے سامنے سر جھکا کر فیروزہ کو قبول کرلے گا۔"

"واقعی تم ایک عظیم شریک حیات ہو۔ تمہاری جیسی بہویں سسرال کی عزت اور عظمت کا پرچم بن کر رہتی ہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں کو نہ معلوم ہو کہ فیروزہ نے شادی سے پہلے کہیں منہ کالا کیا تھا۔"

"ہرگز نہیں معلوم ہوگا۔ ہم یہ بات ساری دنیا سے چھپائیں گے۔"

"چھپانے کے لیے بڑی رازداری سے بچے کو ختم کرنا ضروری ہے لیکن فیروزہ اس کے لیے راضی نہیں ہے۔"

وہ گرجتے ہوئے اٹھ کر بولا "راضی کیسے نہیں ہو گی؟ اس کا باپ بھی راضی ہوگا یہ غلاظت میرے گھر میں نہیں پلے گی کہاں ہے وہ؟"

"شاید اپنے کمرے میں ہے۔"

وہ ادھر جانے لگا۔ سلمیٰ پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بولی "آپ دماغ ٹھنڈا رکھیں اور خیال رکھیں اندر کی آواز باہر نہ جائے۔"

وہ دونوں آگے پیچھے فیروزہ کے دروازے پر آئے' جواد نے دھیمی آواز میں ڈپٹ کر کہا "فیروزہ! باہر آؤ۔"

سلمیٰ نے آگے بڑھ کر دستک دی تو پتا چلا' وہ بند نہیں ہے۔ ذرا سا کھل گیا تھا۔ انہوں نے پوری طرح کھول کر دیکھا کمرا خالی تھا۔ سلمیٰ نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ فیروزہ وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ پلٹ کر کمرے میں آئی۔ بستر کی چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ تکیے کے پاس ایک چھوٹا ریکارڈر اور دو کیسٹ پڑے ہوئے تھے۔ جواد نے غصے سے کہا "بے حیا' بے شرم' یہاں فلمی گانے سن رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں گئی ہے۔"

وہ بستر سے دور تھا۔ سلمیٰ نے قریب سے گزرتے ہوئے یونہی کیسٹ پر نظر ڈالی تو ایک دم سے گھبرا گئی۔ دونوں کیسٹوں پر لکھا ہوا تھا "اکبر میرا دلبر۔"

وہ فوراً ہی جواد کے پاس آکر اس کا بازو تھام کر اسے کمرے سے لے جاتے ہوئے بولی "آپ اپنے کمرے میں چل کر لباس تبدیل کریں۔ میں فیروزہ کے کمرے کی تلاشی لوں گی۔ کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے جس سے اس شخص کا پتا چل سکتا ہے جس کا نام وہ چھپا رہی ہے۔"

وہ بولا "مجھے بھی تلاشی میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔"

"ہرگز نہیں وہاں بہن کی ایسی کوئی چیز برآمد ہوسکتی ہے جسے بھائی کو نہیں دیکھنا چاہیے۔"

اس نے قائل ہوکر سر ہلادیا۔ وہ اسے اپنے بیڈ روم میں چھوڑ کر فیروزہ کے کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کرکے تیزی سے کیسٹوں کے پاس آئی پھر ایک کیسٹ کو ریکارڈر میں لگایا۔ اس میں سیل موجود تھے اس نے بٹن دبا کر اسے آن کیا اور آواز کو بہت دھیما رکھا تاکہ کوئی بات باہر تک نہ جائے۔

ریکارڈر سے بہت دھیمی آواز ابھری۔ سلمیٰ نے اسے کان سے لگا لیا۔ فیروزہ کی آواز آرہی تھی "ہیلو بھابی سہیلی! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوچکی ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اپنے بھائی کے خلاف میرا چیلنج سن کر تم میرے کمرے میں ضرور آؤ گی۔ اسی لیے دونوں کیسٹوں پر اکبر کا نام لکھ دیا ہے۔ یقیناً" تمہارا تجسس بڑھ گیا ہوگا۔ اور شاید اب تم اسے سن رہی ہو۔"

ایک ذرا توقف سے پھر آواز ابھری "ضرور سنو۔ آگے جو باتیں اور ہوس کی گھاتیں ہیں انہیں شرعی عدالت بھی سنے گی۔ ایسے دس کیسٹ ہیں اور ان کی ماسٹر کاپیاں میرے بینک کے لاکر میں ہیں۔ ابھی میں قانونی چارہ جوئی کے لیے جہلم وومنز لائرز ایسوسی ایشن میں

جارہی ہوں۔ میری واپسی تک یہ کیسٹ سماعت فرماؤ۔"

فیروزہ کی یہ تمہید ختم ہوتے ہی ریکارڈر سے بجلی کے کڑکنے اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ بارش کی رم جھم بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر اکبر اور فیروزہ کی باتیں ابھرنے لگیں۔ سلمٰی کے دیدے حیرانی اور پریشانی سے پھیل گئے۔ کیونکہ ان کی باتوں سے ثابت ہو رہا تھا کہ اکبر بارش میں بھیگتا ہوا رکاوٹیں توڑتا ہوا فیروزہ کی تنہائی میں آیا ہے اور فیروزہ نے اپنی بھابی سے جواد کی ایک دھوتی مانگ کر رکھی ہے تاکہ اکبر گیلے کپڑوں میں نہ رہے۔

یعنی ایسی ایسی باتیں ہو رہی تھیں اور دونوں کی زبان سے ایسے اعترافات ہو رہے تھے جنہیں سن کر ثابت ہو جاتا تھا کہ دونوں کی گناہگار ملاقاتوں کا سہرا سلمٰی کے سر ہے اور جب سلمٰی ان کی معاون رہی ہے ...تو پھر وہ اپنی بہن کے کمرے سے گزر کر ہی فیروزہ کے کمرے میں پہنچتا ہوگا۔

اگرچہ ان کیسٹوں میں پیار بھری شاعرانہ گفتگو بھی تھی اور کچھ بے حیائی کے اشارے بھی تھے لیکن مجموعی طور پر یہ ثبوت مل جاتا تھا کہ فیروزہ اور اکبر گناہگار ہیں اور بہرحال گردن زدنی ہیں۔

اور سب سے زیادہ دل دہلا دینے والی بات یہ تھی کہ سلمٰی کے بیان کے مطابق برسات کی اس رات جب ساس کا قتل گلی میں ہوا تھا' کوئی ان کی کوٹھی میں نہیں آیا تھا۔ جبکہ کیسٹ میں بارش کی آواز بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی تھی۔ پھر اکبر کے رخصت ہوتے وقت فیروزہ نے کہا تھا "تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔ شاید بارش تھم جائے۔"

اکبر نے کہا "رات کے تین بج گئے ہیں بارش کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا تو صبح ہوجائے گی۔"

یوں تو انہوں نے اور بہت سی باتیں کی تھیں لیکن اتنا ہی کافی تھا کہ اکبر نے رات کے تین بجے اس کوٹھی سے نکلنے کا اعتراف کیا تھا اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق بیگم عنایت حسین کا قتل رات کے تین اور چار بجے کے درمیان ہوا تھا۔

سلمٰی نے ریکارڈر کو آف کردیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ درودیوار گھومتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اگرچہ فیروزہ اور اکبر کی طرح اسے سزائے موت نہ ملتی لیکن وہ گناہ کے لیے سہولتیں پیدا کرنے اور ساس کے قتل کے سلسلے میں تعاون کرنے کی مجرم تھی تھوڑی بہت سزا ضرور ہوگی۔ جیل کی چار دیواری مقدر میں لکھی جائے گی۔ پھر جواد اپنی ماں کے قاتل کی شریک کو طلاق بھی دے سکتا تھا۔

فیروزہ نے ایک ہی جھٹکے میں دن کو تارے دکھادیے۔ ساس اور سسر کے مرنے کے بعد وہ کروڑوں کی جائداد کی مالکہ بن گئی تھی اب وہ ملازمہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ طلاق کے بعد سماجی حیثیت بھی صفر ہونے کو تھی۔ جیل جاکر مجرمہ ہونے کا داغ لگنے والا تھا بچہ

بھی جواد لے لیتا۔ نند کی کوکھ اجاڑنے والی اپنا ہی بچہ ہارنے کو تھی۔ آج تک کسی پہلوان نے کسی پہلوان کو اس بری طرح نہیں پچھاڑا تھا جیسے فیروزہ نے اسے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے فوراً" اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے۔ ورنہ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اس نے دونوں کیسٹوں کو اٹھا کر اپنے لباس میں چھپالیا فیروزہ نے کہا تھا دس کیسٹیں ہیں۔ وہ باقی کیسٹیں تلاش کرنے لگی۔ کیسٹ کی ریک میں رکھے ہوئے ایک ایک کیسٹ کو الٹ پلٹ کر سننے لگی۔ غزل اور گیتوں کی آوازیں آتی رہیں لیکن کوئی مطلوبہ کیسٹ نہ ملا۔

وہ مایوس ہوکر سوچنے لگی۔ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ وہ چھوٹا ریکارڈر اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔ اپنے کمرے کی طرف دیکھا وہاں جواد اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ اکبر کو فون کے ذریعے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتی تھی اور یہ میاں کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی مرحوم ساس سسر کے کمرے میں آئی وہاں دوسرا ٹیلیفون تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اپنے لباس کے اندر سے ایک کیسٹ نکال کر اسے ریکارڈر میں لگایا پھر فون کے ذریعے رابطہ کیا وہ دوسری طرف منتظر تھا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی بولا "ہیلو آپا! کیا ہوا؟"

"میری بربادی کا سامان ہوگیا ہے اور تم بھی اپنی حماقت سے سزائے موت تک پہنچنے والے ہو۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ کیسی سزائے موت؟ میں نے ایسی کیا حماقت کی ہے؟"

"تم جب بھی فیروزہ سے تنہائی میں ملنے جاتے تھے' اپنی اور اس کی باتیں کیسٹ میں ریکارڈ کراتے رہتے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے میں نے فیروزہ کے کمرے میں کبھی کوئی ریکارڈر نہیں دیکھا تھا پھر وہ ریکارڈ کیسے کرتی۔"

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس نے تم سے چھپا کر تمام ملاقاتوں کو ریکارڈ کیا ہے۔ لو ذرا نمونہ سنو۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس کو ریکارڈر کے پاس لاکر آن کردیا۔ تقریباً" دس منٹ تک سنانے کے بعد اسے بند کرکے ریسیور کان سے لگا کر پوچھا "کیا سنا؟ اور کیا سمجھا؟"

"یہی سمجھا کہ اس کیسٹ سے گناہگار ثابت ہوجاتا ہوں۔"

"پورا کیسٹ سنوگے تو معلوم ہوگا کہ گناہ کے راستے میں ہموار کر رہی ہوں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہی رات ہے جب میری ساس کا قتل ہوا تھا۔ آگے جاکر تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم تین بجے رات کو اس کوٹھی سے باہر آرہے ہو اور ڈاکٹری رپورٹ کہہ چکی ہے کہ وہ قتل تین اور چار بجے کے درمیان ہوا تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ! وہ تو ہمیں بری طرح پھنسانا چاہتی ہے۔"

"پھنسانا چاہتی ہے نہیں وہ ایسا کرچکی ہے۔ اس وقت جہلم وومنز لائرز ایسوسی ایشن میں بیٹھی ہے اس سے پہلے کہ وہ ہمیں شرعی عدالت میں گھسیٹے اسے روک لو محبت سے روک لو یا عدالت سے کسی طرح بھی اپنی اور میری جان بچاؤ۔"

"درست کہتی ہو۔ اب تو بچاؤ کے لیے کچھ بھی کرنا ہوگا۔ میں اس سے ملنے جارہا ہوں۔"

چودھری اکبر علی نے بہن سے رابطہ ختم کرکے انکوائری سے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کے فون نمبرز معلوم کیے۔ پھر ان کے مطابق ڈائلنگ کی۔ رابطہ ہونے پر ایک خاتون کی آواز سنائی دی وہ بولا "ہیلو میں چودھری اکبر علی ہوں۔ ایڈووکیٹ بشریٰ صاحبہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ بڑی دیر انتظار کرنے کے بعد دوسری آواز سنائی دی "ہیلو میں بشریٰ ربانی بول رہی ہوں کیا آپ واقعی چودھری اکبر علی ہیں؟"

"جی ہاں میں ہی وہ ناچیز بندہ ہوں۔"

"تعجب ہے آپ تو بڑی جلدی دوڑ پڑے۔ ابھی تو ہم حدود آرڈیننس کے مطابق ابتدائی کاغذات تیار کر رہے ہیں۔"

وہ پریشان ہوکر بولا "دیکھیے محترمہ! پلیز یہ معاملہ ابھی اپنی ہی حد تک رکھیں۔ اسے آگے نہ بڑھائیں مجھے فیروزہ سے سمجھوتا کرنے کا ایک موقع دیں۔"

"آپ کس قسم کا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اس سے ایک بار ملاقات کرکے کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"پلیز ہولڈ آن۔"

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔ "ہیلو چودھری صاحب! آپ دو گھنٹے بعد فیروزہ کے بھائی اور بھابی کے پاس ان کی کوٹھی میں جائیں وہیں فیروزہ سے ملاقات ہوگی۔"

"لیکن میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔"

"نو مور آرگومنٹس اینڈ دیٹس آل۔"

ادھر سے فون بند کردیا گیا چودھری اکبر نے ہیلو ہیلو کہہ کر کئی بار پکارا۔ پھر جھنجلا کر ریسیور پٹخ دیا۔ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا "فیروزہ ذہین اور ضدی ہے مگر اتنی چالاک دکھائی نہیں دیتی تھی جتنی چالاکی اب دکھا چکی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھ سے چھپا کر خلوت کدے کی تمام باتیں ریکارڈ کرسکتی ہے۔"

حقیقتاً" وہ چالاک نہیں تھی۔ اس نے عداوتی ارادوں سے ایسا نہیں کیا تھا۔ دراصل وہ فطرتاً" رومانی اور جذباتی لڑکی تھی۔ عام طور پر محبوب کو یاد کرتے رہنے کے لیے اس کی کوئی نشانی یا خطوط وغیرہ سنبھال کر رکھے جاتے ہیں۔ فیروزہ نے جدید سہولتوں کے مطابق کیسٹس میں اس کی یادوں اور ملاقاتوں کو محفوظ کیا تھا اور اکبر کو محض شرم و حیا کے باعث رومانی اور جذباتی لمحات کی ریکارڈنگ کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

عورت شہد کی مکھی ہے' نہ چھیڑو تو شہد دیتی ہے چھیڑو تو زہریلے ڈنک مارتی ہے۔ وہ شرم سے جیتی ہے اور شرم سے مرجاتی ہے اگر یہ شرم چھین لی جائے اور اسے آبرو باختہ کہا جائے تو پھر وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر اپنا ننگا چہرہ لے کر اپنے یار کو سنگسار کے مقام پر لے آتی ہے۔ اس نے جن کیسٹس کو شرم و حیا کے باعث اپنے محبوب سے بھی چھپایا تھا اب انہیں سرعام لاتے ہوئے نہیں شرما رہی تھی۔ اس عزم اور حوصلے کے ساتھ کہ یہ بے رحمی اس کی اولاد کو تحفظ دے گی۔

چودھری اکبر علی اپنے کمرے سے باہر آیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اپنے باپ کے کمرے کے سامنے آیا اور دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک خوب صورت کنیز نے اندر سے دروازہ کھولا اور اسے جھک کر سلام کیا۔

اس نے اندر آکر دیکھا۔ باپ شاہانہ طرز کے پلنگ پر شاہانہ انداز میں نیم دراز تھا۔ دوسری خوب صورت کنیز اس کے پاؤں داب رہی تھی۔ اس نے بیٹے کو دیکھ کر کہا "آؤ بابا کی جان! کیا بات ہے؟"

وہ قریب آتے ہوئے بولا "بابا جانی! میں ایک معاملے میں بری طرح پھنس رہا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ حدود آرڈیننس کی زد میں آجاؤں گا۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

وہ پوری تفصیل سے اپنی اور فیروزہ کی روداد سنانے لگا۔ چودھری قاسم علی ایک شاہ کے انداز میں جیسے فریاد سن رہا تھا اور ہوں ہوں کہتا جارہا تھا۔ اس نے تمام روداد سننے کے

بعد کہا "تم نے ہماری بیٹی اور اپنی بہن کے سسرال میں یہ گڑ بڑ کی ہے اس لیے پھنس گئے ہو- وہاں تم نے صرف عیاشی ہی نہیں کی ایک قتل بھی کیا ہے یہ کسی دوسرے گھر کی بات ہوتی تو ہم ماں کے بعد بیٹی کا بھی صفایا کردیتے لیکن دو باتیں تمہارے حق میں نہیں ہیں-"

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا "ایک تو یہ کہ فیروزہ تم سے زیادہ تیز رفتار ہے- جو ارادہ کرتی ہے فوراً اس پر عمل کرتی ہے- یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے لاکر میں صرف دس کیسٹیں ہیں اس کا یہ تحریری بیان بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی ماں کے قتل کی رات تم وہاں موجود تھے- تم نے اسے بھی قتل کی دھمکی دی ہے- لہٰذا جب بھی اس کی غیر طبعی موت ہوگی وہ تمہارے ہاتھوں ہوگی-"

وہ بولا- "جی ہاں- ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے اسے کچھ اور داؤ پیچ بتائے ہوں گے-"

چودھری نے کہا "دوسری بات جو تمہارے حق میں نہیں ہے' وہ ہماری بیٹی سلمٰی کی بربادی ہے- وہ کروڑوں روپے کی جائداد کی مالک اور چودھرائن بن چکی ہے- ہم باپ بیٹے فیروزہ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں غلطی کریں گے تو ہماری سلمٰی عزت اور عظمت کی بلندیوں سے ذلت کی پستیوں میں آگرے گی-"

"بابا جانی! پھر تو ایک ہی راستہ ہے فیروزہ سے نکاح پڑھانا ہوگا-"

باپ نے گھور کر دیکھا- بیٹے نے جلدی سے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں اسے آپ کی بہو نہیں بنانا چاہتا- میں تو آپ کے اصولوں پر چلتا ہوں- جو داشتہ کے طور پر مل رہی ہو اسے صرف احمق ہی بیوی بناتے ہیں-"

"ہوں' تم سلمٰی کے گھر جاؤ- فیروزہ تم سے وہاں ملاقات کرنے والی ہے- دیکھو کہ وہ کیا کہتی ہے' کس حد تک تمہاری بات مان کر بچے کو ختم کرسکتی ہے- اگر وہ نہ مانے اور قانونی طور پر مضبوط دکھائی دے تو اس سے شادی کے لیے راضی ہوجاؤ-"

"مگر بابا جانی! شادی کے بعد بھی وہ ہمارے اعصاب پر سوار رہے گی- میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ وہ میری مردانگی کے لے گالی بن جائے-"

"وہ گالی نہیں بنے گی- اعصاب پر سوار نہیں ہوگی- جاؤ اور اس سے وعدہ کرو کہ کل تم مختصر سی برات لے کر آؤ گے میں ... چودھری قاسم علی بھی اسے اپنی بہو بنانے آؤں گا-"

"کیا واقعی بابا جانی؟"

"ہاں کل ہم وہاں جائیں گے لیکن نکاح پڑھانے کی نوبت نہیں آئے گی-"

"کیا آپ فیروزہ کو ..."

"نہیں- کسی کا قتل نہیں ہوگا' جو ہوگا' وہ کل دیکھو گے اب جاؤ یہاں سے-"

وہ باپ کو سلام کرکے اپنے کمرے میں واپس آیا- دیر تک سوچتا رہا کہ ایسی کیا بات ہوگی کہ برات آئے گی اور نکاح نہیں پڑھایا جائے گا- اسے اپنے باپ کی جاگیر دارانہ چالوں پر پورا بھروسا تھا اور وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس معاملے میں خون خرابا نہیں ہوگا-

وہ دو گھنٹے بعد فیروزہ سے ملنے آیا- سلمٰی نے دروازہ کھولا بھائی کو دیکھ کر آہستگی سے بولی "جواد اپنے کمرے میں ہیں- تم مجھ سے یہیں باتیں کرو اور بتاؤ فیروزہ کے معاملے میں کیا کر رہے ہو؟ کیا اس سے ملے تھے؟"

"ایڈووکیٹ بشریٰ سے فون پر بات ہوئی تھی- اس نے بتایا کہ وہ دو گھنٹے بعد یہاں مل سکتی ہے اسی لیے ملنے آیا ہوں-"

"وہ تو ابھی تک نہیں آئی پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی ہے-"

"فکر نہ کرو آپا! سب ٹھیک ہوجائے گا-"

"کیا ٹھیک ہوجائے گا؟ میرا گھر اجڑنے والا ہے میرا شوہر چھوٹنے والا ہے- اس لڑکی کو اپنی اور خاندان کی عزت کی پرواہ نہیں ہے- وہ عدالت میں ہم سب کو ننگا کردے گی- میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں خدا کے لیے ابھی قاضی کو بلا کر اس سے نکاح پڑھالو- اپنے ہونے والے بچے کو قبول کرلو- تم اپنے گھر خوش رہو ہمیں اپنے گھر خوش رہنے دو-"

وہ بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا "ہم سب خوش رہیں گے بابا جانی اس معاملے میں کچھ کرنے والے ہیں- فی الحال یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ ہمارے خلاف کیا کرتی پھر رہی ہے-"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی- اکبر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا- سامنے فیروزہ کھڑی ہوئی تھی- دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ ایک طرف ہٹ گیا- فیروزہ اندر آئی- سلمٰی اسے گلے لگانے کے انداز میں آگے بڑھتی ہوئی بولی "میری سہیلی کہاں چلی گئی تھی؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں-"

وہ ہاتھ اٹھا کر بھائی کو قریب آنے سے روکتی ہوئی بولی "دور سے باتیں کرو- تمہارے خاندان والوں کو گلے لگا کر گلا کاٹنا خوب آتا ہے-"

جواد نے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا "اچھا اکبر آیا ہے" پھر فیروزہ کو دیکھ کر پوچھا "تم کہاں گئی تھیں؟ میرے ساتھ آؤ- میں تنہائی میں ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں-"

فیروزہ کے ہاتھوں میں ایک فائل تھی- اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر جواد کو دیتے ہوئے کہا "پہلے آپ اسے پڑھ لیں اس کے بعد ضروری ہوا تو آپ سے تنہائی میں باتیں کروں گی-"

جواد وہ کاغذ لے کر پڑھنے لگا- فیروزہ نے ایسا ہی دوسرا کاغذ سلمٰی کو اور تیسرا کاغذ اکبر کو دیا- سب اسے توجہ سے پڑھنے لگے- جہلم وومنز لائر ایسوسی ایشن کی چیئر مین ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے چودھری اکبر علی اور جواد حسین کے نام وہ قانونی نوٹس ارسال کیا تھا- وہ اس نوٹس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پڑھ رہے تھے-

تحریر کچھ یوں تھی کہ فیروزہ بنت چودھری عنایت حسین مرحوم نے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے- موکلہ نے جو تحریری بیان دیا ہے اس کے مطابق چودھری

اکبر علی نے اسے عشق و محبت کے سبز باغ دکھائے۔ شادی کا وعدہ کیا۔ اب یہ موکلہ تین ماں سے حاملہ ہے۔ چودھری اکبر علی کا رویہ منفی ہوگیا ہے۔ وہ شادی کے معاملے کو ٹال رہا ہے اور اس کے حمل کو ضائع کرنے پر بضد ہے۔

اس سلسلے میں حسب ذیل نکات قابل توجہ ہیں۔

میری موکلہ نے محبت میں گناہ گار بن جانے کا تحریری اعتراف کیا ہے اور ایسے آڈیو کیسٹس کے ڈپلیکیٹس پیش کیے ہیں جن میں چودھری اکبر علی بھی برابر کا گناہ گار ثابت ہوتا ہے۔

جہلم وومنز ایسوسی ایشن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مظلوم خواتین کو آسان طریقہ کار کے ذریعے انصاف ملے۔ گھریلو اور خاندانی جھگڑے اور ان سے پیدا ہونے والے شرمناک معاملات عدالت میں نہ جائیں اور ہماری میز پر ہی فریقین میں صلح صفائی ہوجائے۔

لہٰذا مسمی جواد حسین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی بہن فیروزہ کو انصاف دلانے کے لیے اس سے ہمدردی اور ہم سے تعاون کریں۔

اور مسمی چودھری اکبر علی سے درخواست ہے کہ وہ عداوت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ وہ بچہ جو دنیا میں آنے والا ہے' اس کی ہلاکت کا مرتکب نہ بنے۔

اس ضمن میں موکلہ فیروزہ کی ایک تحریری درخواست موجود ہے جس میں موکلہ نے یقین سے لکھا ہے کہ اس کی اور بچے کی جان کو چودھری اکبر علی سے خطرہ ہے۔ اگر کبھی غیر طبعی موت ہوگی تو میری ایسی موت کا ذمے دار چودھری اکبر علی کو ٹھہرایا جائے۔

اور یہ کہ موکلہ کی موت کے بعد اس کے بینک لاکر کو کھولنے اور تمام کیسٹس اور اہم کاغذات کو اپنی تحویل میں لینے کا حق صرف ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو ہے۔

اب یہ چودھری اکبر علی کی صوابدید پر ہے کہ وہ مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اس نوٹس کے جاری ہونے کی تاریخ سے دو دن کے اندر ہماری موکلہ فیروزہ سے نکاح پڑھالے اور تحریری طور پر فیروزہ کی جان و مال کا اور اس کے سماجی اور ازدواجی حقوق کا ضامن رہے۔

اگر ہمارا مشورہ چودھری اکبر علی کے لیے قابل قبول نہ رہا تو دو دن کے بعد اس معاملے کو باقاعدہ مقدمے کی شکل دے کر عدالت میں پہنچا دیا جائے گا۔"

اکبر' سلمیٰ اور جواد وہ کاغذات پڑھتے پڑھتے بیٹھ گئے تھے پھر اس کے اختتام پر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جواد نے کہا "تم اپنے بھائی کے کالے کرتوت چھپا رہی تھیں۔ کیا اسے پڑھنے کے بعد اپنے جھوٹ اور مکاری سے انکار کروگی؟"

وہ بولی "آپ میرے مجازی خدا ہیں۔ مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں اس کے لیے آپ مجھے سو جوتے ماریں لیکن پہلے خاندان کی عزت بچانے کی بات کریں۔"

وہ بیوی کی بات سے قائل ہوکر فیروزہ سے بولا "تمہیں کسی ایڈووکیٹ کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا میں مرگیا تھا؟ کیا تم مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں؟"

سلمیٰ نے کہا "جو باتیں ایک بھائی کو کہنے کی نہیں ہوتیں کیا وہ باتیں یہ آپ سے کرتی؟ پہلے عقل سے تولا کریں پھر بولا کریں۔ ہماری فیروزہ نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ابھی اس معاملے کو عدالت تک نہیں لے گئی ہے۔ ابھی یہ قانون کی زبان سے اکبر کو سمجھا رہی ہے۔"

اکبر سر جھکائے کھڑا تھا۔ فیروزہ کے سامنے کمزور پڑ کر اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔ شکست کی وجہ سے توہین ہوتی ہے لیکن وہ عورت کی وجہ سے بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ مرد نے عورت کو اس قدر اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے کہ کسی معاملے میں اس سے کمتر ہونا نہیں چاہتا۔ اپنی دانستہ غلطیوں کے باوجود برتر رہنا چاہتا ہے اور یہ سراسر تکبر ہے انسانی تدبر نہیں ہے۔

اس نے سر اٹھا کر سلمیٰ سے کہا "آپا! یہ بات آگے نہیں بڑھے گی میں کل صبح دس بجے بابا جانی کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا' چار بندے ہمارے ہوں گے اور چار تمہارے' پھر میں نکاح پڑھا کر فیروزہ کو اپنی شریک حیات بنالوں گا۔"

فیروزہ نے اپنے محبوب کو پالینے کی مسرتوں سے نہال ہوکر اسے دیکھا لیکن اکبر کو یوں لگا وہ اس کی شکست پر مسکرا رہی ہے۔ وہ غصہ سے پلٹ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جواد نے کہا "میری لاعلمی میں جو کچھ ہوا وہ میرے لیے شرم کی اور ڈوب مرنے کی بات ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ معاملہ عزت آبرو سے نمٹ رہا ہے۔"

سلمیٰ نے فیروزہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "آج میں بہت خوش ہوں میری سہیلی کل یہاں سے دلہن بن کر جائے گی۔"

"بھابی! میں دلہن ضرور بنوں گی مگر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن شادی کے بعد دلہن سسرال جاتی ہے۔"

"اس لیے جاتی ہے کہ بے چاری دلہنوں کو پہلے سے سسرال کا جغرافیہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ میں جانتی ہوں وہاں میری ایک سوکن اور دو سوتیلے بچے ہیں۔ ایک ایسا چالاک سسر ہے جو زمینیں حاصل کرنے کے لیے صغریٰ جیسی بے یارومددگار لڑکی کو بہو بنا کر کچرے کی طرح کہیں پھینک دیتا ہے۔ اور کسی تقریب وغیرہ میں بہو کو خاندانی اور سماجی مان مرتبہ نہیں دیتا ہے۔ ایسا سسر میرے ساتھ کیسا سلوک کرے گا یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں اور یہ جو میرا مجازی خدا بننے والا ہے اسے تو میں شادی سے پہلے ہی اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔"

سلمیٰ چپ چاپ اپنے باپ اور بھائی کی بے عزتی برداشت کر رہی تھی اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ فیروزہ نے کہا "اس لیے کل نکاح کے بعد میں اسی گھر میں

رہوں گی۔ پھر اکبر اسی شہر میں میری رہائش کا الگ انتظام کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس رات سلمٰی فون پر کبھی بھائی سے اور کبھی باپ سے باتیں کرتی رہی۔ ان سے یہ کہتی رہی کہ فیروزہ کو نکاح کے بعد میکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اس کی علیحدہ رہائش کا فوراً انتظام کریں اور نند سے اس کا پیچھا چھڑائیں۔

فیروزہ نے اسی شام ایڈووکیٹ بشریٰ کو اپنی شادی کی خوشخبری سنائی۔ اسے اور وومنز لائرز ایسوسی ایشن کی چند خواتین لائرز کو شادی میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ وہ سب خواتین کے مسائل حل کرنے کے معاملات میں پیش پیش رہتی تھیں اس لیے دوسری صبح دس بجے جواد کی کوٹھی میں حاضر ہوگئیں۔

جواد نے اپنے خاندان کے پانچ بزرگوں کو مدعو کیا تھا۔ چودھری قاسم علی بھی پانچ بزرگوں کے ساتھ آیا۔ ڈرائنگ روم میں فرشی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف خواتین بیٹھ گئیں۔ تب چودھری قاسم علی نے بلند آواز سے کہا "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے شہر کی سب سے مشہور و معروف ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی یہاں تشریف رکھتی ہیں مجھے امید ہے کہ محترمہ کی موجودگی سے میرا ایک مسئلہ حل ہوجائے گا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ میں جن قاضی صاحب کو یہاں لارہا تھا انہوں نے آنے سے انکار کردیا ہے۔"

ایک بزرگ نے پوچھا "انہوں نے انکار کیوں کیا ہے؟"

چودھری نے کہا "قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں حاملہ عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام بزرگ چونک گئے "حاملہ عورت؟ اور نکاح؟"

سب ایک دوسرے سے کچھ نہ بول رہے تھے۔ بشریٰ ربانی گہری سوچتی ہوئی نظروں سے چودھری قاسم علی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بزرگ غصے سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے "لاحول ولا قوۃ" ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم خلاف شرع ایسی بہو لینے آئے ہو؟"

چودھری نے کہا "میں مجبور تھا۔ اس شہر کی سب سے بڑی ایڈووکیٹ نے نوٹس بھیجا تھا کہ دو دن کے اندر میں نے اپنے بیٹے اور فیروزہ کا نکاح نہ پڑھایا تو ہمیں عدالت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

کتنے ہی بزرگوں نے سوالیہ نظروں سے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو دیکھا۔ چودھری نے کہا "بزرگو! آپ یہ نہ سمجھیں کہ ایڈووکیٹ صاحبہ ہماری دشمن ہیں۔ یہ تو میرے بیٹے اور اپنی موکلہ فیروزہ کو عدالتی سزا سے بچانا چاہتی ہیں۔ اگر ابھی یہ شادی ہوجائے تو میرا بیٹا اور ہونے والی بہو قانون کی نظروں میں گناہ گار نہیں رہیں گے۔"

ایک نے کہا "ارے میاں عقل کی بات کرو۔ سیاہ کپڑے پر لفظ سفید لکھ دینے سے وہ

سفید نہیں ہوجائے گا۔ سیاہ ہی رہے گا۔ اسی طرح جو گناہ ہے وہ نکاح کے بعد بھی گناہ رہے گا۔"

دوسرے نے کہا "اتنے دلائل کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ایک ہی بات جانتے ہیں، مذہب میں حاملہ عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس ناجائز کام میں شریک نہیں ہوں گے۔"

سب ہی اٹھنے لگے اور کہنے لگے "چلو چلو۔ ہمیں تو اس گھر کا پانی بھی نہیں پینا چاہیے۔"

وہ سب جانا چاہتے تھے۔ جواد اور کچھ افراد انہیں روکنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کیا پھر چٹخنی چڑھادی۔ باہر جانے کے لیے وہی ایک دروازہ تھا۔ جانے والوں میں سے ایک نے غصے سے کہا "یہ کیا حرکت ہے آپ دروازہ کھولیں۔"

"وہ بولیں "پہلے آپ حضرات میری گزارش سنیں گے پھر یہ کھل جائے گا۔"

دوسری خواتین لائرز بھی بشریٰ ربانی کے آس پاس آکر راستہ روک کر کھڑی ہوگئیں۔ بزرگ حضرات پیچھے ہٹ گئے۔ایک نے کہا "بیٹی! ہم جانتے ہیں تم بہت ذہین ایڈووکیٹ ہو لیکن تم نے چودھری کو جو نوٹس دیا ہے اس سے ایک مذہبی حکم کی نفی ہوتی ہے اور ہم مذہب کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کریں گے۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "الحمد اللہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں بھی مذہب کے خلاف کوئی بات گوارا نہیں کرتی۔ میں ایک سوال کرتی ہوں کیا اللہ تعالیٰ گناہگاروں کی توبہ قبول کرتا ہے؟"

سب نے کہا "بے شک گمراہی سے لوٹ آنے والوں کی توبہ قبول ہوتی ہے۔"

"آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ توبہ اور معافی کے بعد فیروزہ اور اکبر گناہگار نہیں کہلائیں گے۔"

"ہم مانتے ہیں لیکن ان کے گناہ معاف ہوئے یا نہیں یہ اندازہ کیسے ہو؟"

"ان دونوں کو آپ بزرگ حضرات معاف کریں گے۔یہ نکاح کے ذریعے راہ راست پر آنا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں رشتہ ازدواج میں منسلک کرکے دعائیں دیں۔ یاد رکھیں آپ نفرت سے انہیں چھوڑ کر جائیں گے تو یہ مزید گناہگار بنتے رہیں گے۔ آپ محبت سے دعائیں دیں گے تو انہیں نیک اعمال کی ترغیب ملے گی۔"

ایک بزرگ نے کہا "بیٹی! تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔ لیکن معاف کرنا... شیطان بھی ایسی ہی لچھے دار باتیں کرتا ہے۔ تم یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہو کہ حاملہ عورت سے نکاح جائز ہے۔"

"ہرگز نہیں" بشریٰ ربانی نے کہا "ایسا نکاح جائز نہیں ہے میں نے چودھری اکبر علی کو

جو نوٹس دیا ہے اس میں نکاح کی وضاحت نہیں ہے۔ میں قانون داں ہوں میرے نزدیک ایک قاضی ایک وکیل اور دو گواہوں سے نکاح عمل میں آتا ہے۔ اگر یہ حضرات گواہی دیں گے اور آپ حضرات تائید کریں گے تو فیروزہ اور اکبر میاں بیوی کہلائیں گے اور اگر آپ سب انکار کریں گے تو میں کل ہی دو گناہگاروں کا مقدمہ عدالت میں پہنچا دوں گی بولو چودھری قاسم علی کیا کہتے ہو؟"

وہ پریشان ہو کر بولا "نہیں محترمہ! یہ' ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے' نکاح ہو جائے تو اچھا ہے۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "یہ نکاح اس لیے نہیں ہے کہ یہ دونوں ازدواجی رشتہ قائم کرلیں چونکہ دینی حکم کے مطابق نکاح جائز نہیں ہے اس لیے یہ دونوں نامحرم رہیں گے۔ فیروزہ اکبر سے پردہ کرے گی' اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہے گی۔"

ایک نے پوچھا "پھر ایسے نکاح کا فائدہ کیا ہے؟"

"درحقیقت یہ نکاح ایک معاہدہ ہے کہ اکبر ہی فیروزہ کے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ معاہدہ یہ ہے کہ فیروزہ کی زچگی عدت کے بعد اکبر پھر آج کی طرح آپ لوگوں کو یہاں لائے گا اور باقاعدہ نکاح پڑھوا کر فیروزہ کو شریک حیات بنائے گا۔"

سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑگئے۔ بشریٰ ربانی نے کہا "چودھری قاسم علی! تم قاضی صاحب کو لاتے تب بھی میں قانونی نکاح نامے پر نکاح ہونے نہیں دیتی۔ میں نے ابھی جو کہا ہے اسی کے مطابق ایک معاہدہ تیار کرکے لائی ہوں۔ یہ معاہدہ ایک عارضی نکاح یعنی ایک عہد نامہ ہے کہ زچگی کے بعد فیروزہ کو اکبر کی طرف سے نکاح اور ازدواجی زندگی کے جائز حقوق ملیں گے۔ اس معاہدے پر آپ تمام حاضرین کے دستخط ہوں گے۔"

بشریٰ ربانی نے ایک خاتون وکیل سے چند کاغذات لے کر چودھری قاسم علی کو پیش کیے وہ کاغذات لے کر پڑھنے لگا اور اپنے بزرگوں کو سنانے لگا۔ فیروزہ کو ہر پہلو سے تحفظ فراہم کرنے اور تمام جائز حقوق دلانے کے لیے سخت شرائط پیش کی گئی تھیں۔ چودھری انہیں تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اکلوتے جوان بیٹے کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے دستخط کردیے۔ پھر باری باری سب ہی نے دستخط کردیے۔ اکبر اور فیروزہ کے بھی دستخط لیے اس طرح یہ نکاح نما معاہدہ تکمیل کو پہنچا۔

واپسی میں باپ بیٹا اور ان کے پانچ بزرگ پجیرو میں سفر کر رہے تھے بیٹے نے کہا "بابا جانی! ہم ایک سخت معاہدے کے جال میں جکڑ گئے ہیں۔"

باپ نے کہا "کوئی بات نہیں بابا کی جان! میں چاہتا تھا نکاح نہ ہو وہ نہیں ہوا یہی ہماری جیت ہے۔"

"لیکن زچگی کے بعد تو نکاح ہوگا۔"

"بیٹے! کل کس نے دیکھی ہے۔ آج کی بات کرو۔ کم از کم چھ ماہ زچگی کے اور اس

کے بعد چلہ نہانے تک وہ تمہاری بیوی نہیں ہے' میری بہو نہیں ہے۔ اپنے میکے میں بدنامی کا پیٹ لے کر رہے گی... کتنوں کو معاہدہ دکھائے گی کہ آئندہ کبھی تم اس سے شادی کرنے والے ہو کتنے لوگ ہیں جو معاہدہ پر یقین کریں گے۔"

"بابا جانی! لوگ ہم سے تصدیق کریں گے۔"

"معاہدہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس مدت کے پورا ہونے تک ہمیں اسی شہر میں رہنا ہوگا۔ لٰہذا نہ ہم رہیں گے اور نہ ہی کسی کے سامنے تسلیم کرنے کی نوبت آئے گی کہ ہم نے ایسا کوئی معاہدہ کیا ہے۔"

اکبر نے کہا "میں ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔"

چودھری نے ایک بزرگ سے کہا "وڈے چاچا! میں زمینوں پر چلا جاؤں گا۔ آپ یہاں رہ کر سڑک چھاپ غنڈوں موالیوں کو خریدیں گے۔"

وڈے چاچا نے کہا "فکر نہ کرو بہت اچھی طرح ان غنڈوں سے کام لوں گا۔"

چودھری نے دوسرے بزرگ سے کہا "نکے چاچا! ہماری چاچی سماجی کارکن ہیں۔ آپ ان کے ذریعے عورتوں کا محاذ قائم کریں گے۔ ہر علاقے اور محلے کی دو چار عورتیں ہونی چاہئیں تاکہ فیروزہ جہاں سے گزرے وہاں سے طعنے ملتے رہیں۔ دماغی ٹارچر پہنچانے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جائیں۔"

نکے چاچا نے کہا "تم جو چاہتے ہو اس سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ ہم اسے دماغی مریضہ بنادیں گے۔"

"ہاں اسے زندہ رکھنا ہے مگر مردے سے بدتر بنانا ہے۔ اس نے تحریری بیان دیا ہے کہ اگر اسے ہلاک کیا جائے گا یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مرے گی تو اس کی موت کا ذمے دار میرے بیٹے کو ٹھہرایا جائے گا لٰہذا ہم اسے جسمانی طور پر کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اسے زندہ رکھیں گے۔"

پھر وہ حقارت سے بولا۔ "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ وکیلوں اور بیرسٹروں کو سب سے زیادہ عقل ہوتی ہے؟ ہوتی ہوگی مگر جاگیرداروں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ ایڈووکیٹ بشریٰ نے ہی فیروزہ سے لکھوایا ہوگا کہ اسے میرا بیٹا قتل کرسکتا ہے۔"

اس نے قہقہہ لگایا پھر کہا "نہیں قتل کرے گا بھئی میرا بیٹا ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ ماں بننے والی زندہ رہے گی لیکن بچہ پیٹ میں رہ کر مرے گا تو ایڈووکیٹ بشریٰ اس کی موت کا ذمے دار کسے ٹھہرائے گی؟"

اس نے پھر قہقہہ لگایا اور کہا "سنا ہے بچہ یوں مرجائے تو اس کا زہر ماں کے جسم میں پھیل جاتا ہے۔"

وہ ہنستا جارہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ کامیاب منصوبہ بندی کا نشہ ایسا ہوتا ہے کہ سامنے سے صرف دشمن کی موت دکھائی دیتی ہے' اپنی نظر نہیں آتی یکبارگی اکبر نے چیخ ماری "بابا

جانی!"

اس کے بعد بابا جانی کو یہ بتانے کا موقع نہیں ملا کہ مخالف سمت سے آنے والے آئل ٹینکر سے تصادم ہو رہا ہے۔ تصادم سے دو چار سیکنڈ پہلے ہی اکبر نے پھرتی سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر چھلانگ لگادی پھر نشیب میں دور تک لڑھکتے ہوئے زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ اس کے بعد اس کے سر میں بھی دھماکا سا ہوا لڑھکنے کے دوران اس کا سر ایک بڑے پتھر سے ٹکراگیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

موت ہماری تمہاری تدبیر سے نہیں آتی۔ اس کی پلاننگ حجیرو میں بیٹھ کر نہیں ہوتی آسمانوں میں ہوتی ہے۔ قدرت بڑی سبق آموز ہے۔ سانپ کے منہ میں زہر بھر کر ہمیں سبق سکھاتی ہے کہ یہ جسے چاہے گا اسے ڈس نہیں پائے گا ڈسنے سے پہلے اپنے مقدر کی موت مرجائے گا۔ چودھری قاسم علی اپنے چار عدد پہنچے ہوئے بزرگوں سمیت ایک پل میں فنا ہوگیا۔

اکبر کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے فیروزہ نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی زخمی کو حوصلہ دینے کے لیے ضرور مسکرانا چاہیے لیکن اکبر کو وہ زہر لگ رہی تھی۔ اس لڑکی نے تمام داؤ پیچ ناکام بنادیے تھے۔ جاگیردارانہ مزاج کے خلاف ان کے ذہنوں پر مسلط ہو رہی تھی۔ ان کے حواس پر چھا رہی تھی۔ اس منحوس کی وجہ سے اس کے باپ کو ایک زبردست حادثہ...

اس نے چونک کر پوچھا "بابا جانی خیریت سے ہیں؟"

فیروزہ نے سر جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پوچھا "اسی اسپتال میں ہیں؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا وہ گرج کر بولا "کچھ منہ سے پھوٹو۔"

وہ بدستور سر جھکائے دھیمی آواز میں بولی "صبر کرو۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔"

اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ بے ہوشی سے پہلے اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ ابھی کی بات لگ رہی تھی وہ موت کی پلاننگ کرنے والا ابھی زندہ تھا اور ابھی مرگیا اور وہ بچہ زندہ ہے۔

وہ فیروزہ کے پیٹ کو گھورنے لگا۔ آدمی نصیحت کے اسباب کو توجہ سے دیکھے تو نصیحت حاصل ہوتی ہے اور گھور کر دیکھے تو صرف غصہ ہی دماغ پر حاوی ہوتا ہے۔ اس نے غصے سے اسپتال کے کمرے کو دیکھا پھر بستر سے اٹھتے ہوئے بولا "گھر میں بابا جانی کی میت رکھی ہوگی اور تم مجھے یہاں لے آئی ہو۔"

"مجھے رعب نہ دکھاؤ۔ تمہارے رشتے دار تمہیں یہاں لائے ہیں۔ میں تو خدمت کرنے اور اپنا فرض ادا کرنے آئی ہوں۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کرنے چلا گیا۔ اس خاندان کا

سربراہ سب سے بڑا جاگیردار اور چار بزرگ حادثے میں مرگئے تھے۔ جب اس کوٹھی میں بیک وقت پانچ لاشیں آئیں تو کہرام مچ گیا۔ عورتیں چھاتی پیٹنے لگیں۔ مرد سر پٹخنے لگے۔ حادثہ کیسے ہوا؟ یہ اکبر بھی آہ و زاری کے دوران نہ بتاسکا۔ سارا خاندان صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ مرنے والے دلہن بیاہ کر لانے گئے تھے۔ ڈولی کی جگہ اپنے جنازے لے آئے تھے۔

جاہل عورتوں نے کہا "فیروزہ منحوس ہے۔ اس نے کچھ ایسا جادو ٹونہ کیا ہے کہ جس کے نتیجے میں اپنے ہونے والے مرد کو زندہ رکھا اور اس کے تمام بزرگوں کو مار ڈالا تاکہ سسرال میں اکیلی راج کرے۔"

جو جادو ٹونے کو نہیں مانتے تھے وہ بھی فیروزہ کے خلاف سوچ رہے تھے اور اکبر کے خیال میں تو وہ جونک بن گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کا اور اس کے خاندان والوں کا خون چوستی جارہی تھی۔

فیروزہ نے دوسرے دن اسے فون پر مخاطب کیا پھر کہا "دیکھو فون بند نہ کرنا کل تم نے اسپتال میں مجھے تعزیت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے..."

"یو شٹ اپ" اس نے فون بند کردیا۔

فیروزہ نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ پھر گونگے ریسیور کو دیکھ کر کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد دوسری بار رابطہ کیا۔ اکبر نے پوچھا "ہیلو کون ہے"

وہ بولی "آڈیو کیسٹ ہوں۔ تم دیکھ چکے ہو کیسٹ کیا گل کھلاتے ہیں۔"

"ہاں دیکھ چکا ہوں' پتا نہیں تم نے یہ ریکارڈنگ والی چالاکی کہاں سے سیکھ لی تھی۔ اب اس کے ذریعے جونک کی طرح چمٹ گئی ہو۔"

"میں نے جونک بننا تم سے سیکھا ہے۔ گریبان میں جھانک کر دیکھو' تم محبت کے نام پر میرا خون چوستے رہے۔ میں تمہیں عاشق سمجھتی رہی اور تم جونک بنتے رہے مجھے اپنا عادی بناتے رہے۔ میں تمہاری عادی ہوگئی تو مجھے باندی بنائے رکھنے کے لیے شادی کا معاملہ ٹالنے لگے۔"

"ہاں میں تمہاری جوانی کا لہو چوس رہا تھا۔ اب تم میری مردانگی اور برتری کا لہو نچوڑ رہی ہو۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ میرا وقت پھر آئے گا تو میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی "ایک راز کی بات بتاؤں اکبر! میرے اس فون کے ساتھ ٹیپ منسلک ہے پھر تمہارا ایک کیسٹ تیار ہو رہا ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا "یہ .... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مم..... میں تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں میں معاہدے کے مطابق تم سے شادی کروں گا۔ تمہارے تمام حقوق ادا کرتا رہوں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"محبت کرتے نہیں ہو' یہ تو میں کر رہی ہوں۔"

"جو بھی ہو' محبت تو ہو رہی ہے۔"

"یہ کسی بھی وفا کرنے والی کے لیے دکھ کی بات ہے کہ کوئی اسے کسی خوف کے یا لالچ کے تحت چاہے۔ ویسے ابھی میں نے جھوٹ کہا تھا میرے فون سے ٹیپ منسلک نہیں ہے۔ تمہاری آواز ریکارڈ نہیں ہو رہی ہے۔"

وہ بے یقینی سے بولا "مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو' اب میں ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لاؤں گا' جو معاہدے کے خلاف ہو۔"

فیروزہ نے ہنستے ہوئے رابطہ ختم کردیا۔ اکبر نے اپنے ریسیور کو گھور کر دیکھا۔ پھر اسے رکھ کر دانت پیستے ہوئے فیصلہ کیا کہ بابا جانی نے اپنی موت سے پہلے جو منصوبے بنائے تھے وہ ان پر عمل کرے گا اور اس بلائے جان کو دودھ کی مکھی کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکے گا۔

اس نے دوسرے دن جہلم شہر چھوڑ دیا۔ فیروزہ نے فون کے ذریعے رابطہ کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ پنڈ دادن خان اور ملک وال کی زمینوں پر گیا ہے۔ وہ اس کے جانے پر اعتراض نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ ابھی اپنے مرد کو روکنے ٹوکنے والا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ پھر زمینوں کی دیکھ بھال اور ان کا حساب کتاب رکھنے والا وہی ایک وارث رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ صبر سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے ڈھیلا لباس پہننا شروع کردیا تاکہ پیٹ معلوم نہ ہو۔ باہر کسی کام سے جاتی تو اپنے بدن کو چادر میں چھپالیتی تھی لیکن ابھرنے والا آفتاب ہو یا پیٹ وہ بدلی میں نہیں چھپتا اور عورتوں سے تو کبھی نہیں چھپتا۔ وہ جس گلی سے گزرتی وہاں دو چار عورتیں ضرور کچھ بولتی تھیں۔ کوئی کسی سے کہتی "اے بہن! ذرا دیکھو کیسے اعلانیہ پرچم لہراتی جارہی ہے۔" کوئی کہتی "سوہنی گھڑا لے کر چناب میں گئی تھی۔ یہ جہلم میں جائے گی۔"

ایسی باتوں پر ہنسنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے گزر جاتی تھی سوچتی تھی آئندہ باہر نکلنے سے پرہیز کرے گی لیکن کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ بھائی اور بھابی اسے کوٹھی میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ بھابی زچگی کے لیے میکے چلی گئی تھیں۔ بھائی شرم سے منہ چھپانے کے لیے بیوی کے ساتھ سسرال میں رہنے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ درست تھا محلے سے گزرتا تھا یا دوست احباب میں رہتا تھا تو کسی نہ کسی حوالے سے بہن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ یا وہی باتیں اشارے کنائے میں ہونے لگتی تھیں۔

وہ کچھ جھنجلانے لگی تھی۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا کہ عورت اپنی عزت ہارنے کے بعد اپنے حقوق بھی ہارتی رہے گی اور مرد سے اپنے مطالبات پورے نہیں کرائے گی تو فریب کھاکر قیامت تک کنواری ماں اور داشتہ بنتی رہے گی۔

گناہگار بن کر خود بدنام ہونا اور اپنے خاندان کو بدنام کرنا دانشمندی نہیں ہے اور کوئی شریف زادی جان بوجھ کر رسوائی مول نہیں لیتی۔ مرد کا فریب اس پر رسوائی تھوپ دیتا

ہے۔ ایسے میں آبروباختہ کہلاتے رہنے سے بہتر ہے کہ اسی مرد سے جونک بن کر چمٹ جائے ایک معصوم کو پیٹ کے اندھیرے میں قتل کرنے سے گناہ نہیں چھپتا انسانیت مرتی ہے اور کمزور غیرت والے ہمیشہ بچے کے نام پر انسانیت کو مارتے ہیں۔

ایک روز وہ ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی سے ملنے گئی۔ باہر گلی میں کوئی گاڑی نہیں ملی وہ گلی پار کر کے سڑک پر آئی۔ پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی "ہائے کیا حسن ہے۔ کیا شباب ہے مگر یہ غبارہ گڑبڑ کر رہا ہے۔"

وہ تلملا گئی۔ تیزی سے آگے جانے لگی۔ سڑک پر لوگوں کی آمدورفت تھی۔ دو آوارہ ٹائپ جوان اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ ایک نے کہا "کیسی مجبوری ہے۔ ہمارے خلاف شور مچاؤ گی تو یاران شہر کو جواب دینا ہوگا۔ چادر ہٹا کر بتانا پڑے گا کہ کس کی گٹھری اٹھائے پھر رہی ہو۔"

دوسرے جوان نے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "ہم بہت گناہگار ہیں۔ ہمارے بھی گناہوں کا بوجھ اٹھالو تو نیکی ہوگی۔"

وہ شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا ان کے منہ پر تھوک دے' گالیاں دے' ان سے لڑ پڑے لیکن ان میں سے ایک نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ شور مچائے گی تو اسے پیٹ کا حساب دینا ہوگا۔

کمبخت کوئی رکشہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان سے نظریں چراتی ہوئی بولی "مسلمان ہو تو میری قسم کا اعتبار کرو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اس بچے کا باپ ہے۔ وہ چند ماہ بعد آئے گا اور بچے کو گود میں لے کر پورے شہر کو میری محبت شرافت اور بے گناہی کا یقین دلائے گا۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا "جو بچے شادی سے پہلے پیدا ہوتے ہیں' ان کے باپ کبھی دیکھنے میں نہیں آتے۔"

اس نے سوال کیا "تم کیسے جانتے ہو کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے؟"

"ہم بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور دو کوڑی کی عورتوں کو پہچان لیتے ہیں۔"

ایک رکشہ قریب آکر رک گیا۔ حالانکہ اس نے خالی رکشہ پر دھیان نہیں دیا تھا۔ نہ ہی ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا تھا۔ ویسے اس کے رکنے سے بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھتی ہوئی بولی "کچہری روڈ جہلم کورٹ چلو۔"

رکشہ آگے چل پڑا دونوں لفنگے پیچھے رہ گئے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی لیکن تھوڑی دیر بعد اطمینان ختم ہوگیا۔ رکشہ شاندار چوک کے موڑ پر رک گیا۔ ڈرائیور نے انجن بند کردیا فیروزہ نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ پلٹ کر اس کے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا رکشہ زیادہ لوڈ برداشت نہیں

کرتا ہے۔"

فیروزہ کو جیسے پتھر آکر لگا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہوگیا کہ یہ رکشے والا کسی اشارے کے بغیر کیوں اس کے پاس آکر رکا تھا۔ یعنی وہ بھی جانتا تھا کہ اس ماں بننے والی کو بے خوف و خطر اذیت پہنچائی جاسکتی ہے۔

ڈرائیور مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا "کسی قریبی زچہ خانے میں چلی جاؤ لوڈ کم کر کے آؤ۔ میں آگے لے چلوں گا۔"

وہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "تم درست کہتے ہو۔ یہ بچہ بہت وزنی ہے۔ اسے ماں کے سوا کوئی برداشت نہیں کرسکے گا۔"

پھر وہ اچانک اسے انگلی دکھاتی ہوئی تیزی سے بولی "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بچہ ناجائز ہے؟"

وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا "ارے وہ منشی را..."

وہ بولتے بولتے ایک دم سے رک گیا۔ بے خودی سے اچانک سنبھل گیا پھر بولا "ارے مجھے کون بتائے گا۔ میں دس برس سے رکشہ چلا رہا ہوں۔ بھانت بھانت کی عورتوں کو ادھر سے ادھر پہنچاتا ہوں۔ تمہاری چال سے پتا چل رہا تھا کہ ٹیکسی ہو۔"

وہ دانت پیس کر بولی "کتے کے بچے! تیری ماں نے بھی نو ماہ تک تیرا لوڈ اٹھا کر تجھے انلوڈ کیا تھا۔ اسے بھی ٹیکسی بول۔"

"اے خبردار! میری ماں تک پہنچے گی تو ابھی لوگوں کو جمع کر کے تیرے گناہوں کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"

"تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ تیرے منہ سے منشی رحیم الدین کا آدھا نام سن کر ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔"

"کیا معلوم ہوگئی؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ اچانک شہر کے غنڈوں اور رکشہ ڈرائیوروں کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے اور میں گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں۔ یہ چودھری اکبر علی کا منشی رحیم الدین تم جیسے لوگوں کو خاصی رقم دے رہا ہے تاکہ پورے شہر میں مجھے اس قدر ٹارچر کیا جائے کہ میں دماغی مریضہ بن جاؤں یا گھبرا کر خودکشی کرلوں۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں کسی منشی کو نہیں جانتا میرے رکشے سے اتر جاؤ۔"

"اگر میں چودھری اکبر علی سے یہ کہہ دوں کہ تم نے اور منشی نے مجھے چودھری کی سازش کے متعلق بہت کچھ بتادیا ہے تو چودھری کے غنڈے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ فیروزہ نے کہا "چودھری نے حکم دیا ہوگا کہ مجھے دماغی تکالیف پہنچانے کے لیے چھیڑا جائے۔ لیکن لوگوں میں مجھے بدنام نہ کیا جائے میری گناہ گاری کو

پولیس اور تھانے تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ ایسا ہوگا تو چودھری بھی میرے ساتھ پکڑا جائے گا۔"

وہ عاجزی سے بولا "میں اندر کی بات نہیں جانتا ہوں مگر مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں چھیڑوں لیکن لوگوں کی بھیڑ نہ لگنے دوں اور اس سلسلے میں چودھری یا منشی کا نام آئے گا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر ایک شرط ہے۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ آج کل چودھری اکبر علی کہاں ہے؟"

"بی بی جی! بتاؤں گا مرجاؤں گا۔"

"نہیں مروگے ہاں نہیں بتاؤگے تو مروگے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں رکشہ ڈرائیور نہیں ہوں' چودھری صاحب کا ملازم ہوں۔ منشی نے کہا تھا میں تھوڑی دیر کے لیے رکشہ لے جاکر آپ کو پریشان کروں پھر واپس آجاؤں۔"

اس کا مزید بیان سن کر پتا چلا کہ جو غنڈے بدمعاش راستے میں ملتے رہے' وہ سب اکبر کے زر خرید تھے۔ اور وہ آج کل اسی شہر کے شمال مغرب میں جادہ نامی بستی میں رہتا تھا وہاں اس کا ایک بنگلا تھا۔

چودھری کے ملازم نے فیروزہ کو رکشے میں بشریٰ ربانی کے دفتر تک پہنچایا' وہ بولی "میں جب تک نہ کہوں' یہاں سے نہیں جاؤگے۔ میرا انتظار کروگے میری باتوں پر عمل کرتے رہوگے تو چودھری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس نے رکشے والے کو دھمکی بھی دی اور تحفظ کا یقین بھی دلایا۔ پھر ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کے پاس آئی۔ بشریٰ ربانی نے بڑے پیار سے اس کا استقبال کیا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر خیریت پوچھی۔ فیروزہ اسے تمام روداد سنانے کے بعد بولی "اکبر جادہ کے ایک بنگلے میں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ادھر کبھی نہیں جاتی ہوں اس لیے وہاں چھپ کر مجھے ٹارچر دے رہا ہے۔ میرے علاقے میں بھی اس نے چند کرائے کی عورتیں چھوڑی ہوں گی۔ ان عورتوں کی شہ پر میرے محلے پڑوس کی عورتیں مجھے طعنے دینے لگی ہیں۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "اس میں شبہ نہیں کہ چودھری اکبر علی تمہیں تنہا بدنام کرنے کے کامیاب ہتھکنڈے آزما رہا ہے اور اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑ رہا ہے۔ تمہیں خودکشی یا پاگل پن کے مقام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کیا اب بھی اس سے وفا کی امید رکھوگی؟"

"اس سے وفا کی امید بہت پہلے ہی دم توڑ چکی ہے۔ اب تو بچے کی خاطر اسے جبراً وفادار بناکر رکھنا ہے۔ کیا آپ ابھی ایک قانونی نوٹس جاری کرسکتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں آپ کے پاس حاضر ہوجائے۔ حاضر نہ ہونے کی صورت میں میں اسے عدالت

میں بلاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ وہ جس بنگلے میں روپوش ہے اس کا پتا لکھ دو۔ میرا سیکیورٹی گارڈ نوٹس لے کر جائے گا اور اسے ساتھ لے کر آئے گا۔"

"باہر اکبر کا ایک ملازم رکشہ ڈرائیور بنا ہوا ہے۔ وہ آپ کے گارڈ کو دور سے بنگلا دکھائے گا۔"

"ٹھیک ہے تم ویٹنگ روم میں بیٹھو۔"

وہ وہاں سے دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہاں دو خواتین بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ فیروزہ بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ سندھ میں سیلاب نے جو تباہی مچائی تھی اس کی دستاویزی فلم دکھائی جارہی تھی۔ سکھر سے کوٹری تک پندرہ ہزار سے زیادہ دیہات پانی میں ڈوب گئے تھے۔ اندازاً" دو لاکھ افراد بے گھر ہوچکے تھے۔ گوٹھ ماہی' سونو خان' بھٹی ماچھن' جو گوٹھ' بانو رن گوٹھ' اور گوٹھ صالیاپور میں پانی نے تباہی مچائی تھی اور ٹمیاری سے سعید آباد کے درمیان نو میل طویل علاقہ سیلاب کی زد میں تھا۔ کئی مقامات پر ریلوے کا نظام معطل ہوگیا تھا۔ سیکڑوں میل لمبی سڑکیں اور درجنوں پل ٹوٹ گئے تھے۔

یہ وہ وقت تھا' جب سندھ میں سیلاب کا غصہ دھیما پڑتا جارہا تھا اور پنجاب میں طوفانی بارش تہلکہ مچا رہی تھی۔ ابھی سیلاب کا خطرہ معمولی تھا۔ یہ سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ خطرہ غیر معمولی اور اعصاب شکن ہوجائے گا۔ جہلم کے شہری اپنے گھروں میں بیٹھے سندھ میں ہونے والی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے اور کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ان پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد بشریٰ ربانی نے فیروزہ کو بلایا "وہ ویٹنگ روم سے اٹھ کر چیمبر میں داخل ہوئی تو وہاں ایک کرسی پر اکبر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا "فیروزہ! نوٹس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی تم آواز دیتیں تو میں چلا آتا۔"

وہ بولی "میں نے جہلم کے کنارے کھڑے ہوکر صدا لگائی تھی میری آواز کبھی "وچلے بیلے" تک گئی کبھی پنڈ دادن خان پہنچی پھر تمہاری تمام جاگیر میں بھٹک کر واپس آگئی۔ تب بازگشت نے چغلی کھائی کہ تم جادہ والے بنگلے میں ہو۔"

"ہاں...وہ میں کل رات ہی یہاں آیا تھا۔ آج تم سے ملنا..."

وہ بات کاٹ کر بولی "کل رات نہیں پچھلے پندرہ دن سے یہاں ہو اور اس تین ماہ کے عرصہ میں کئی بار آچکے ہو۔"

وہ ذرا لاجواب ہوا پھر بولا "دراصل معاہدے میں یہ درج نہیں ہے کہ شادی سے پہلے مجھے تمہارے پاس حاضری دیتے رہنا چاہیے۔"

"کوئی بات نہیں۔ نیا معاہدہ ہوجائے گا۔ ہمارے ہونے والے بچے کے خلاف شہر میں ایک وبا پھیل رہی ہے۔ غنڈوں' بدمعاشوں' رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو فکر لاحق ہوگئی

ہے کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے اور بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ کوئی دشمن مجھے خودکشی کرنے یا دماغی مریضہ بننے کی راہ پر لگا رہا ہے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو' میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"زیادہ سمجھنے کی ضرورت کیا ہے۔ میں شہر میں بدنام ہو رہی ہوں' تم مجھے ذلتوں سے بچاؤ۔"

"کیسے بچاؤں؟"

"تم میرے ساتھ شہر کی سڑکوں پر چلو گے تو لوگوں کی زبانیں بند ہوتی جائیں گی۔ یہاں سے میرے گھر تک کوئی مجھ سے شادی اور بچے کی بات نہیں پوچھے گا تم میرے اچھے اور برے کردار کا لیبل بن کر رہو گے۔"

"لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تمہارے لیے نامحرم ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ راستہ چلتے وقت کتنے ہی نامحرم ہمارے شانہ بشانہ رہتے ہیں۔ بسوں اور ٹرینوں میں سینما گھروں میں اور محفلوں میں محرم اور نامحرم کا فرق مٹا دیا جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں گا۔"

"مجھے گھر میں تنہا چھوڑ کر جاؤ گے تو کرائے کی عورتیں اور غنڈے پھر چھیڑنے آ جائیں گے۔"

"کوئی چھیڑنے نہیں آئے گا۔"

"کیا تم انہیں منع کر دو گے؟"

"ہاں منع..." وہ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا "وہ میرے کوئی رشتے دار یا زر خرید تو نہیں ہیں کہ میرے منع کرنے سے مان جائیں گے۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں مجھے کوٹھی میں تنہا چھوڑ کر نہ جانا' چونکہ نامحرم ہوں اس لیے انیکسی میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دوں گی۔"

وہ بڑی مجبوری اور بے بسی سے کبھی فیروزہ کو اور کبھی ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو دیکھنے لگا۔ بشریٰ ربانی نے کہا "مسٹر اکبر! میرا وقت برباد نہ کرو۔ تم نے شہر میں جو بدنامی کی فصل بوئی ہے اسے کاٹو۔ فیروزہ کو نارمل رہنا اور بچے کو سلامتی سے پیدا ہونا ہے اور اب یہ تمہارے سائے میں ہی ممکن ہے۔"

وہ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آج تک بڑی آسانی سے مچھلیاں پکڑی تھیں۔ ہوس کے دریا میں کانٹا ڈالتا تھا اور اپنی پسند کی مچھلی پھانس لیتا تھا۔ یہ کہاوت بھول گیا تھا کہ کانٹا ڈال کر مچھلیاں پکڑنے والوں کے حلق میں بھی مچھلی کا کانٹا پھنس جاتا ہے۔

وہ دفتر سے باہر آتے ہوئے بولا "مجھے میری برداشت سے زیادہ جھکانا چاہو گی تو میں ٹوٹ جاؤں گا۔ میں تناور درخت ہوں' ٹوٹ کر تمہارے ہی اوپر گروں گا۔ پھر تم بھی

سلامت نہیں رہو گی۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی "یہ ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں زندہ سلامت رہنا نہیں چاہتی۔ تمہارے ساتھ اپنے گناہوں کی سزا پانا چاہتی ہوں۔ یہ تم ہو کہ سزائے موت سے ڈر رہے ہو اور مجھ سے سمجھوتے کرتے جا رہے ہو۔"

"ہاں میں ڈرتا ہوں حرام موت مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر زندہ رہنے کے لیے یہ حساب نہ کرو کہ میں تمہیں کس حد تک جھکا رہی ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ تمہیں مجبور اور بے اختیار بنا کر اپنے کسی جذبے کی تسکین نہیں کر رہی ہوں۔ نہ انتقام لے رہی ہوں۔ میں نے متاعِ آبرو دی ہے اس کے صلے میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتی۔ تمہارے ہی بچے کی جائز سماجی حیثیت اور اس کے حقوق چاہتی ہوں۔ وہ اور ہوں گی جو تمہارے بے حساب بچے کیڑوں مکوڑوں کی طرح پیدا کرتی رہی ہوں گی۔ میں انسان کا بچہ پیدا کر رہی ہوں۔"

وہ عمارت سے باہر آئے۔ اس نے اپنی کار کے پاس پہنچ کر کہا۔ "میں اپنے ڈرائیور کو چھٹی دے رہا ہوں۔ ہم اس کی موجودگی میں باتیں نہیں کر سکیں گے۔"

فیروزہ نے چادر اوڑھنے کا انداز بدل دیا۔ اُسے یوں اپنے بدن پر رکھا کہ پیٹ صاف طور سے نظر آنے لگا پھر اس نے کہا "میں کہہ چکی ہوں تمہارے ساتھ پیدل چلوں گی۔"

"تھک جاؤ گی۔ تمہاری کوٹھی یہاں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے۔"

"ڈرائیور سے کہو گاڑی لے کر پیچھے آتا رہے۔ تھکن ہو گی تو بیٹھ جاؤں گی۔"

"فیروزہ! آسمان کی حالت دیکھو۔ بارشیں ہو رہی ہیں ابھی کسی وقت بھی پھر ہو سکتی ہے۔"

"ہونے دو میں نمک نہیں ہوں اور تمہیں زکام نہیں ہوتا ہے۔ تم اکثر طوفانی بارشوں میں بھیگ کر میری خواب گاہ میں آتے رہے ہو۔"

اس نے جو کرم کیے تھے ان کی مناسبت سے فیروزہ کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا "ہم پیدل جا رہے ہیں۔ ہمارے پیچھے گاڑی لے کر آتے رہو۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولی "وہی اپنے برے اعمال پیچھے چھوڑ کر آگے جاتا ہے۔"

وہ رفتار سست کر کے اس کے برابر ہو گیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا "چادر درست کرو خدا کے لیے پیٹ چھپاؤ۔"

"خود نہیں چھپ رہا تو کوئی کیوں کر چھپائے؟"

"پھر بھی اسے اشتہار بنانا اچھی بات نہیں ہے۔"

"میں پہلے چھپانا چاہتی تھی ڈھیلے کپڑے پہنتی تھی۔ چادر میں چھپتی تھی پھر کرائے کی عورتوں اور غنڈوں نے مجھے مشتہر کر دیا۔ کئی ماہ سے اپنے محلے میں عورتوں کے طعنے اور

نفرتیں برداشت کرتی آرہی ہوں۔ آج تو سرِراہ تمہارے غنڈوں نے حد کردی۔"

"وہ میرے بندے نہیں تھے غلط نہ سمجھو۔"

وہ تڑخ کر بولی "بکواس مت کرو۔ میں نے تمہارے جیسا کم ظرف انسان کہیں نہیں دیکھا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر آس پاس دیکھتے ہوئے بولا "آہستہ بولو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں، کتنے ہی رک گئے ہیں۔"

"تم اسی طرح سمجھوگے کہ میں گھر سے یہاں تک کتنی ذلتیں برداشت کرتی آئی ہوں۔"

اسی وقت بارش ہونے لگی۔ جو لوگ رک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ پانی سے بچنے کے لیے مختلف عمارتوں کی طرف جانے لگے۔ اکبر نے کہا "بھیگنا مناسب نہیں ہے گاڑی میں چلو۔"

"یونہی چلتے رہو تمہارے ساتھ کبھی کھلی فضا میں بھیگنے کا موقع نہیں ملا۔ موسم کو انجوائے کرو۔ مجھے اس وقت ہیرو ہیروئن کے بھیگنے والے کتنے ہی فلمی سین یاد آرہے ہیں۔"

وہ بڑے صبر سے بڑے جبر سے بھیگتا جارہا تھا۔ فیروزہ کا لباس بدن سے چپک گیا تھا۔ پیٹ اور نمایاں ہوگیا تھا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا پلیز اسے چھپالو۔"

"میں قسم کھاچکی ہوں اسے نہیں چھپاؤں گی۔ یہ پورے شہر میں ڈنکے کی طرح بجتا ہوا تمہارے ساتھ چلے گا۔"

"فیروزہ! خدا کے لیے کوئی ایسا سمجھوتا کرو کہ مجھے اس عذاب سے نجات ملے۔"

"میں نے تمہارے باپ اور بزرگوں کی موجودگی میں ایک دانش مندانہ معاہدہ کیا۔ اس کے مطابق آئندہ ہماری شادی ہونے تک تم سکون سے رہ سکتے تھے لیکن تم نے اپنی کم ظرفی ثابت کردی ہے۔ تم ہتھیلی پر آگ رکھ کر بھی اپنی محبت اور شرافت کا یقین دلانا چاہوگے تو میں دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ تم سے کسی معاملے میں رعایت نہیں کروں گی۔"

وہ چپ رہا۔ دل ہی دل میں گالیاں دینے لگا۔ سوچنے لگا ایسی ہی موسلا دھار بارش میں اس کی ماں کو میں نے مٹی میں ملایا تھا لیکن اس کمبخت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکل رہی ہے۔ اتنی بارشیں ہورہی ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلیاں کڑک رہی ہیں۔ ایک بجلی اس کمبخت پر نہیں گر رہی ہے۔

اس نے فیروزہ کو کوٹھی میں پہنچایا پھر کہا "میں جارہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک اپنا لباس اور ضروری سامان لے آؤں گا۔"

"خیری جاؤ خیری آؤ۔"

وہ اپنی کار میں اپنے گھر آیا۔ بڑی دیر تک بارش میں بھیگنے کے بعد دماغ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ بلکہ روشن ہوگیا تھا اور وہ روشن خیالی سے سوچ رہا تھا۔ اسے فیروزہ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ غصے کے دوران یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ دشمن کے قریب رہنے سے اس کی کوئی کمزوری ضرور ہاتھ آتی ہے۔ تقدیر کسی لمحے میں بھی مہربان ہوکر اس سے نجات حاصل کرنے کا موقع فراہم کرسکتی ہے۔

اب تو تقدیر ہی پر تکیہ تھا۔ کسی تدبیر سے اسے قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا تھا زچگی کا وقت قریب آتے آتے وہ کمزور اور بیمار ہوجاتی۔ ایسے وقت علاج کے دوران اس کی دواؤں میں گڑبڑ کی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح صحت مند اور تگڑی دکھائی دیتی تھی جبکہ ساتواں مہینہ تھا۔ اس کے خلاف نہ تقدیر کوئی کرشمہ دکھا رہی تھی نہ تدبیر کام رہی تھی اور نہ ہی بددعائیں اس پر اثرانداز ہورہی تھیں۔

بارش کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ جیسے رکنا نہیں چاہتا تھا ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے معلوم ہو رہا تھا کہ ایبٹ آباد، کالا باغ اور نیلم کی وادیوں میں غضبناک بارش ہو رہی ہے۔ پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہوچکے ہیں اور کشمیر کے پہاڑوں سے اترنے والی بارش راولپنڈی اور ضلع جہلم وغیرہ کو بھی اپنے نرغے میں لے رہی ہے۔

جہلم کے شہری بارش کا یہ منظر دیکھ رہے تھے اور اندازہ کر رہے تھے کہ دریا میں زوردار سیلاب آئے گا۔ لوگ اسی حد تک سوچ رہے تھے، جس حد تک ماضی کے چھوٹے بڑے سیلابوں کا منظر دیکھ چکے تھے۔ چونکہ قیامت کسی نے نہیں دیکھی ہے اس لیے کوئی بھی قیامت خیز سیلاب کی توقع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اکبر نے فیروزہ سے کہا۔ "بارش تھم گئی ہے باہر موسم قابلِ دید ہوگا۔ کیا خیال ہے تھوڑی آؤٹنگ ہوجائے؟"

وہ بولی "خیال اچھا ہے۔ مجھے باہر کی تازہ ہوا ملے گی میں لباس بدل کر آتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے جواد کی آواز آئی "ہیلو اکبر! کیا تم بول رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپا کہاں ہیں؟"

"میں نے امی کو اور تمہارے تمام گھر والوں کو پنڈی بھیج دیا ہے۔ گھر کے گراؤنڈ فلور میں جتنا قیمتی سامان تھا وہ سب اوپر پہنچا دیا ہے۔ میں اس وقت منگلا آفس سے بول رہا ہوں۔"

"گھر والوں کو پنڈی کیوں بھیج دیا؟ بات کیا ہے؟"

"سیلاب کا خطرہ ہے۔ ہمیں خفیہ طور سے خصوصی اطلاع ملی ہے کہ زبردست سیلاب آئے گا۔ ابھی سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا جارہا ہے کیونکہ اعلان ہوتے ہی شہر میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔"

"لیکن جواد بھائی! شہریوں کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ یوں قیمتی جانیں اور مال و متاع محفوظ رہے گا۔"

"اکثر محکمہ موسمیات کی پیش گوئیاں غلط ہوتی ہیں۔ اگر سیلاب نہ آیا تو خواہ مخواہ شہر میں سراسیمگی پھیلی رہے گی اور شہر ضلع انتظامیہ کو گالیاں دیتے رہیں گے۔ ضلع انتظامیہ کے افسران کہتے ہیں پہلے پکی خبر دیں پھر شہریوں کو خبردار کیا جائے گا۔ اور تم بھی کیا بحث لے بیٹھے ہو۔ میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ تم فیروزہ کے ساتھ جتنی جلدی ہوسکے وہاں سے نکل جاؤ۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں سے نکل رہے ہو نا؟"

"ٹھیک ہے۔ ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ اکبر ریسیور رکھ کر اٹھ گیا فیروزہ کے کمرے کی طرف جانے لگا تاکہ اسے صورت حال سے آگاہ کرے۔ پھر وہ چلتے چلتے رک گیا ایک دم سے ذہن میں شیطانی سوال پیدا ہوا۔ اگر یہ سیلاب میں ڈوب جائے گی' بہہ جائے گی' مرجائے گی' تو سارے مصائب ختم ہوجائیں گے۔

اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ رگوں میں لہو گرم ہونے لگا فیروزہ نے اپنی ایڈووکیٹ صاحب کو یہ لکھ کر دیا تھا کہ اگر اس کا قتل ہویا حادثاتی موت ہو تو اس کا ذمے دار چودھری اکبر علی ہوگا۔ لیکن سیلاب تو موت کا قدرتی ذریعہ ہے۔ اس میں ڈوبنے والوں کی موت کی تفتیش نہیں ہوتی کہ انہیں کس نے ڈبویا؟

لاہور واپڈا فلڈ وارننگ سسٹم کی نااہلی یا ناکامی نے ڈبویا؟

عوام کو خبردار کیے بغیر منگلا ڈیم کا گیٹ کھولنے والوں نے ڈبویا؟

ضلعی انتظامیہ کی غفلت اور غیرذمے داریوں نے ڈبویا؟

یا چودھری اکبر علی نے اپنی گناہوں کی گٹھری ڈبو دی؟

تقدیر مہربان ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اب وہ اس پہلو سے سوچنے لگا کہ سیلاب سے خود اسے کیا نقصان پہنچے گا؟

اسے جواد کے ذریعے خطرے کا علم ہوگیا تھا' وہ بچاؤ کی تدبیر کرسکتا تھا۔ فیروزہ لاعلم تھی۔ اکبر نے طے کرلیا کہ اسے بے خبر رکھے گا۔ ایک بات اور اس کے حق میں تھی کہ وہ تیرنا جانتا تھا۔ فیروزہ نہیں جانتی تھی۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ فیروزہ لباس بدل کر آگئی تھی اور پوچھ رہی تھی "کن خیالوں میں گم ہو؟ کہاں پہنچے ہوئے ہو؟"

وہ مسکرا کر بولا "اپنی غلطیوں پر غور کر رہا تھا۔ تمہارے قریب رہ کر تمہاری قدر و قیمت معلوم ہو رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ قریب رہنے سے محبت بڑھتی ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ باہر آئی پھر دروازے کو مقفل کرتی ہوئی بولی "کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟"

"دریا کے کنارے چلیں۔ ذرا دیکھیں پانی کتنا ہے؟"

"پھر تو پیدل چلیں گے۔ یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہے۔"

وہ کوٹھی کے احاطے سے باہر آئے پھر کشادہ گلی سے گزرنے لگے۔ محلے کی کچھ عورتیں اپنے دروازوں اور چھتوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ فیروزہ کچھ اور تن کر چلنے لگی۔ وہ مغرور نہیں تھی۔ صرف اپنے مرد کے ساتھ چلنے پر فخر کر رہی تھی۔ اپنے بچے کو اس کے باپ کا نام دیتی جارہی تھی۔

وہ عورتیں جو کچھ نہ کچھ بولتی تھیں' اب اس کے خلاف زہر نہیں اگل رہی تھیں۔

فیروزہ نے کہا "تم مرد بھی کیا ہوتے ہو؟ ہماری بدنامی بھی ہوتے ہو اور ہماری نیک نامی بھی۔ اب دنیا والوں کی زبانیں بند ہوگئی ہیں۔"

وہ بولا "یہ میں نہیں تمہاری دیوانہ وار محبت تمہیں نیک نامی دے رہی ہے۔"

اکبر! اب عقل آئی ہے کہ لڑکیوں کو پیار میں حد سے نہیں بڑھنا چاہیے۔ دراصل میں نے فیروزہ اور شیرو کی رومانی داستان بچپن میں سنی تھی۔ وہ اس لیے میرے ذہن میں نقش ہوگئی کہ میرا نام بھی فیروزہ ہے۔ اس کی طرح مجھے بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہے۔ پتا ہے اس فیروزہ نے اپنے شیرو کی محبت میں گیارہ منظوم کتابیں لکھی تھیں۔"

"ہاں۔ جانتا ہوں جہلم کی وادی میں دونوں کی محبت کے افسانے آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔ رقیبوں نے شیرو کو شب عروسی میں قتل کردیا تھا۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "پتا نہیں محبت کی انتہا کو پہنچنے والے بے موت کیوں مرتے ہیں؟"

وہ بولا "تم نے بھی محبوب کو پالینے کا ایک نیا انداز اپنایا ہے۔ محبت میں انتہا کر رہی ہو۔"

"سچی محبت سولی پر چڑھتی ہے یا چناب میں ڈوبتی ہے۔ خدا جانے میرا انجام کیا ہوگا؟"

وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ شہر کے بہت سے لوگ آرہے تھے۔ بند کی اونچائی پر خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ دریا کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ سب ہی حالات کا جائزہ لینے آئے تھے۔ اگرچہ دریا سیلابی کیفیت میں تھا۔ کچھ دھمکیاں سی دے رہا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا تھا کہ پانی خطرے کے نشان سے نیچے ہے۔

انسان لاعلمی سے فریب کھاتا ہے اور لاعلمی کے باعث مرتا ہے۔ نظارہ کرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی تین لاکھ کیوسک پانی گزر رہا ہے۔ اگر منگلا ڈیم کے ذمے دار افسران کی غیرذمے دارانہ حکمت عملی سے اچانک تمام اسپل ویز کھول دیے جائیں گے تو نو لاکھ کیوسک سے زیادہ پانی فی سیکنڈ گزرے گا۔

اور تب ڈیم کے انجینیرز اور افسران لاہور واپڈا کے فلڈ کنٹرول سیل کو الزام دیں گے۔ پھر واپڈا والے محکمہ موسمیات اور محکمہ آبپاشی اور فلڈ وارننگ سسٹم وغیرہ پر الزامات

عائد کریں گے یوں پاکستان کی تاریخ میں اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے والے بڑے صاحبان کی نشاندہی کبھی نہیں ہوگی۔

وہ دریا کے کنارے سے واپس آنے لگے۔ شام کے ساڑھے سات بجے تھے' علاقے کے ایک کونسلر کی گاڑی اعلان کرتی پھر رہی تھی "سیلاب آسکتا ہے' آپ حضرات گھر کا سامان اونچی جگہ یا چھت پر لے جائیں۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچائیں۔"

یہ غیر سرکاری اعلان تھا وہ کونسلر اپنا انسانی فرض سمجھ کر لوگوں کو احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ضلعی انتظامیہ خاموش تھی۔ کونسلر کے اعلان کی سرکاری طور پر تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔ سرکاری ذرائع لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ جبکہ اس ملک میں لاعلمی دور کرنے کے کئی قدیم اور جدید ذرائع ہیں۔

چاروں صوبوں میں محکمہ موسمیات کی جائزہ گاہیں ہیں اور ہر ایک گھنٹے میں رپورٹ حاصل کرنے کے اسٹیشن ہیں۔

رپورٹیں حاصل کرنے کے لیے ٹیلی کمیونی کیشن کا نیٹ ورک قائم ہے۔

ٹرانس میٹر اور ٹیلیگرام کے ذریعے بھی رپورٹیں ارسال کی جاتی ہیں۔

سیلاب کے بارے میں پیش گوئی کرنے والا ماحولیاتی مرکز لاہور میں ہے۔ یہ مرکز مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہے اور تمام جائزہ گاہوں سے رپورٹیں وصول کرتا ہے۔

مدار کے گرد چکر لگانے والے سیلائٹ گھنٹوں میں دو بار پاکستان پر سے گزرتے ہیں اور یہاں کی موسمی رپورٹ کی تصاویر متعلقہ اداروں کو بھیجتے رہتے ہیں۔

مملکت خداداد میں جدید ترین راڈار ہیں جو بتاتے ہیں کہ بارش کتنے انچ فی گھنٹے کے حساب سے ہو رہی ہے اور اس حساب سے دریا میں سیلاب کی صورت حال کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے جدید ترین اور ٹھوس معلومات کے ذرائع کی موجودگی میں یہی خیال قائم ہوتا ہے کہ ان شعبوں میں نااہل افسران اور بودے فنی ماہرین ہیں۔

ان کی نااہلی ناتجربہ کاری اور غیر ذمے داری کی سب سے زیادہ سزا جہلم کے شہریوں کو ملنے والی تھی۔ فیروزہ کوٹھی میں آکر کچن کی طرف گئی تاکہ سالن گرم کرے۔ واپسی میں وہ تندور سے روٹیاں لے آئے تھے۔ اکبر فون کے پاس آکر بیٹھ گیا ڈی سی صاحب سے اس کے بابا جانی مرحوم کی اچھی دوستی تھی۔ اس حوالے سے اس نے فون پر رابطہ کیا پھر ملازم کی آواز سن کر پوچھا "صاحب موجود ہیں؟"

"نہیں جناب وہ بیوی بچوں کو اسلام آباد پہنچانے گئے ہیں۔ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ آپ کون ہیں؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ ریسیور رکھ دیا۔ وہ ڈی سی سے سیلاب کے متعلق کچھ معلوم نا چاہتا تھا۔ اندر سے بے چینی تھی کہ سیلاب نہ آیا تو فیروزہ نہیں ڈوبے گی۔ وہ صدق۔۔

دل سے دعا مانگ رہا تھا۔ یااللہ سیلاب آجائے۔ ابھی آجائے۔

ہر بندہ اپنا فائدہ دیکھ کر دعا مانگتا ہے یا بد دعا دیتا ہے۔

اگر شہر میں کسی مرض کی وبا پھیل جائے تو یہ شہریوں کے لیے قیامت اور ڈاکٹروں کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔

بیرونی ممالک سے ملنے والی لاکھوں ڈالرز کی امداد سے کوٹھیاں اور پلازے بن جاتے ہیں اور متاثرین کے سیلاب زدہ شکستہ مکانات مرمت طلب رہ جاتے ہیں۔ اس لیے سیلاب مخصوص افراد کے لیے باعث رحمت ہے۔

اکبر سیلاب کی دعا مانگ رہا تھا' کوئی نئی کمینگی نہیں کر رہا تھا۔

پھر رات کے دس بجے گھروں میں پانی داخل ہوگیا۔ یہ مرکزی بازار' باغ محلہ' شمالی محلہ اور سول لائن کے مکانات تھے۔ یہ پانی پہلے ٹخنوں تک تھا۔ چند منٹوں میں کمر تک آگیا۔ نو دس لاکھ کیوسک پانی کی رفتار گویا بجلی کی رفتار ہوتی ہے۔ ایسی بلائے ناگہانی کے لمحات میں بجلی تو جاتی ہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری کائنات اندھیرے میں ماتم کر رہی ہے۔

یہ پانی پہلے ساحلی آبادیوں میں آیا تھا اور اچانک آیا تھا۔ جن لوگوں نے شام کو اعلان سن کر احتیاطی تدابیر پر عمل کیا تھا انہوں نے اپنے گھر کا قیمتی سامان اور اپنی جانیں بچالی تھیں۔ جن کے مکانات چھوٹے اور کچے تھے انہوں نے درختوں کی بلندیوں پر چارپائیاں باندھ کر وہاں عورتوں اور بچوں کو پہنچا دیا تھا۔

ساحلی علاقے کے بیشتر افراد کے پاس کشتیاں تھیں' وہ کشتیاں زندگی کی علامت بن گئی تھیں۔ ہر کشتی نوح کی کشتی تھی۔ اس پر جسے جگہ مل جاتی وہ موت کے اندھیرے اور سیلاب کے پانی سے نکل کر اونچے خشک مقام تک پہنچ جاتا لیکن کشتی کا کرایہ بڑھ گیا تھا' فی سواری دو سو روپے۔

جس کے پاس دو سو ہیں وہ زندہ رہے ورنہ ڈوب مرے یا درختوں سے لٹکا رہے یا چھتوں پر پانی اترنے کا انتظار کرتا رہے۔ پانی دس سے بارہ فٹ تک تھا۔ کئی مکانوں کی چھتوں پر سے گزر رہا تھا اور دلوں میں یہ دہشت تھی کہ پانی اور بڑھے گا تو اونچی چھتوں پر چڑھے ہوئے لوگ بھی تنکے کی طرح بہہ جائیں گے۔ اس لیے سب ہی کشتی کے ضرورت مند تھے۔

طلب بڑھتی ہے تو ریٹ بھی بڑھتے ہیں۔ پھر دو سو سے زیادہ ادا کرنے والوں کو کشتی میں جگہ ملنے لگی۔ ایسے پانی کے بیچ جہاں دن کا اجالا ہوتا تب بھی دور تک زمین نظر نہ آتی۔ وہاں کاروبار ہو رہا تھا۔ کاروبار کرنے والے بھی مقدر کی خرابی سے ڈوب سکتے تھے۔ لیکن جب تک سلامت تھے نوٹ کما رہے تھے۔

جس علاقے میں چار فٹ پانی تھا وہاں کے ایک بینک میں ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں نے اہل

شہر پر احسان کیا ورنہ بچت اسکیم کے لاکھوں روپے پانی میں بہہ جاتے۔

عورتیں قیمتی سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتی ہیں لیکن زیورات کہیں منتقل نہیں کرتیں۔ کسی کو امانت کے طور پر رکھنے نہیں دیتیں۔ بیٹیوں کو جہیز میں دینے والے زیورات کے سلسلے میں بیٹوں پر بھی بھروسا نہیں کرتیں۔ ایسی عورتوں نے تمام زیورات خود پہن لیے تھے تاکہ وہ اپنی جان کے ساتھ رہیں۔

زیورات سے لدی ہوئی ایک عورت پانی میں بہتی ہوئی ایک درخت کی شاخوں میں آکر پھنس گئی تھی۔ اسی درخت پر پناہ لینے والوں نے اسے دیکھا وہ بیٹی کے جہیز کو بچاتے بچاتے مرگئی تھی۔ کسی مردے کے بدن پر سونے کا بوجھ نہیں رکھا جاتا۔ پناہ لینے والوں نے اس بیچاری کی موت پر افسوس کیا۔ اس کے گلے میں تین عدد نیکلس تھے وہ انہوں نے اتار لیے دس انگلیوں میں دس انگوٹھیاں اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور کنگن تھے انہیں اتارا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ لاش پھول گئی تھی۔ یہ چیزیں جس طرح پہنی گئی تھیں اسی طرح اتاری نہیں جاسکتی تھیں۔ اس لیے انگلیوں کو اور کلائیوں کو چاقو سے کاٹ کر زیورات سے بے چاری کو نجات دلائی گئی پھر اس کی لاش کو آگے بہا دیا گیا۔

ایسے غیر انسانی تماشوں کے برعکس ایمان افروز مناظر بھی دیکھنے میں آتے رہے۔ دلیر اور غیرت مند نوجوان سیلابی ریلے سے لڑتے ہوئے جوان لڑکیوں اور بچوں بوڑھوں کو محفوظ مقامات تک پہنچا رہے تھے کتنے ہی جوان ٹرکوں اور بسوں کے پہیے کھول کر لے آئے تھے اور ان کی ٹیوب کے ذریعے امداد کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ رہے تھے۔

باہر بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کوٹھیوں کے اندر فرشی منزل پانی میں ڈوب گئی تھی۔ پناہ لینے کے لیے پہلی منزل اور چھت رہ گئی تھی۔ اکبر نے کہا "پہلی منزل میں بھی خطرہ ہے چھت پر چلو۔"

فیروزہ سہمی ہوئی سی بڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ لیکن زندگی سے بھی پیار کرتی تھی۔ اس نے کبھی ایسا سیلاب فلموں میں بھی نہیں دیکھا تھا جو تمام کمروں میں تقریباً" دس فٹ کی اونچائی تک لبالب بھرا ہوا ہو۔ یہ سب کچھ ایک موم بتی کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ دن کا وقت ہوتا تو اور دور تک دیکھنے سے اور اوسان خطا ہوتے۔

وہ خود بھی چھت پر جانے کے لیے سوچ رہی تھی۔ لیکن اکبر کے ساتھ جاتے ہوئے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کے چہرے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ باقی تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ آدمی پوری طرح نمایاں نہ ہو تو پراسرار اور بھیانک لگتا ہے۔

وہ موم بتی ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر آئی اکبر اس کے پیچھے تھا۔ چھت پر خاصی ہوا چل رہی تھی' وہاں پہنچتے ہی موم بتی بجھ گئی۔ تاریکی میں اکبر کی آواز

ابھری "حیات انسانی کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہوا کی ایک پھونک سے بجھ جاتی ہے۔"

لہجے میں سفاکی تھی۔ فیروزہ نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ وہ مٹا مٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ ہر سو تاریکی تھی تاہم کھلے آسمان کے نیچے قریب کی چیزیں تھوڑی سی جھلکتی ہیں۔

وہ ذرا پیچھے ہوگئی۔ وہ آگے بڑھ کر بولا "بڑی دیر سے کہہ رہا تھا چھت پر چلو مگر نخرے کر رہی تھی۔ کیا میرے ارادوں کو بھانپ رہی تھیں؟"

وہ سخت لہجے میں بولی "کیسے ارادے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں چاہتا تو کوٹھی کے اندر ہی بھرے ہوئے پانی میں تجھے دھکا دے دیتا۔ مگر وہاں تیرے بچ نکلنے کا اندیشہ تھا۔ اگر تو بھاگ کر کسی کمرے میں چھپ جاتی اندر سے دروازہ بند کرلیتی تو تجھے باہر نکالنے اور قتل کرنے میں بڑی دشواری ہوتی۔"

"قتل؟" وہ پیچھے ہٹ کر بولی "تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ کیا پھر اپنی کمینگی پر آرہے ہو؟"

"کمینی تو تم ہو تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے۔ مجھے ایک زندہ لاش بنا دیا ہے۔ اپنے داؤ پیچ کے ذریعہ مجھے عورتوں سے بدتر بنادیا ہے۔"

وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "بھاگ کہاں بھاگے گی؟ کہاں ہیں وہ تیرے قانونی کاغذات جن پر تو نے لکھا تھا کہ اگر قتل ہوگی یا حادثاتی موت مرے گی تو اس کا ذمہ دار چودھری اکبر علی ہوگا۔"

وہ کترا کر بھاگنا چاہتی تھی۔ نیچے کسی کمرے میں پناہ مل سکتی تھی۔ لیکن زینے کی طرف دوڑنے سے پہلی ہی اکبر نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا پھر اس کے منہ پر ایک ہاتھ مارا وہ پیچھے جاکر چھت کی پختہ زمین پر گر پڑی۔

اس نے کہا "تیری ایڈووکیٹ کا دفتر فرشی منزل میں ہے وہاں بھی پانی گیا ہوگا اور اپنے ساتھ تیرے قانونی کاغذات بہاکر لے گیا ہوگا اور وہ دس کیسٹیں جس لاکر میں ہوں گے وہاں بھی پانی گھس گیا ہوگا۔"

وہ قہقہہ لگا کر بولا "دیکھ اسے مقدر کا تماشا کہتے ہیں میرے گناہ کے تمام ثبوت قدرت نے مٹا دیے۔ مجھ پر قدرت کی یہ مہربانی ظاہر کر رہی ہے کہ وہ بھی مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ عورت ذلت کے لیے زمین پر اتاری گئی ہے اس لیے ہمیشہ ذلیل ہوتی رہے گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "ہمارے پنجاب میں ایک پرانی کہاوت ہے تو نے بھی سنی ہوگی۔ جتی تے رن دی اک مثال آئی۔ آئی تے پائی نہیں تے دور ہٹائی" (جوتی اور عورت کی ایک مثال ہوئی کہ پاؤں میں پوری آئی تو پہن لی ورنہ پھینک دی۔)

وہ زمین پر سے اٹھ رہی تھی۔ اس نے کہا "میں اس بھروسے پر تجھے زندہ نہیں

چھوڑوں گا کہ میرے خلاف تمام ثبوت ضائع ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ محفوظ ہوں اس لیے تجھے اور بچے کو مرنا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لات ماری اگر وہ فوراً ہی نہ گھومتی تو لات پیٹ پر پڑتی۔ پھر اس سے پہلے بچہ مرتا لیکن ممتا کی بے اختیاری نے اسے بچالیا لات کولہے پر پڑی۔ وہ لڑکھڑاتی اور چیختی ہوئی منڈیر پر آکر گری۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اٹھتی یار دشمن نے پیچھے سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے چھت کے کنارے سے دوسری طرف الٹا دیا۔

اس کی چیخ دور تک گونجی۔ پھر گہرے پانی میں چھپاکا سا ہوا۔ پانی کے اڑتے ہوئے چھینٹے اکبر کے اوپر بھی آئے۔ "بچاؤ' بچاؤ!" اس کی آواز ابھر رہی تھی اور ڈوب رہی تھی۔ اکبر منڈیر پر سے جھک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے اور مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ بولا۔ "چلاتی رہو۔ میں حد سماعت تک ایسے کتنے ہی چیخنے پکارنے والوں کی آوازیں سن چکا ہوں۔ ان حالات میں کون سمجھے گا کہ قتل ہو رہا ہے۔"

وہ وہاں سے پلٹ گیا۔ چھت پر گری ہوئی موم بتی تلاش کرنے لگا۔ چھت کے نیچے کوٹھی کے باہر وہ کبھی ڈوب رہی تھی اور کبھی ابھر رہی تھی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ یونہی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ ڈوبنا مقدر بن گیا ہے۔

لیکن مقدر کے بدلتے ہوئے مزاج کو کون سمجھا ہے جو سمجھے گا۔ اچانک کسی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ خوف سے اور تکلیف سے چیخ پڑی۔ پھر گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ گہرے پانی کی سطح پر تھی اور ڈوب نہیں رہی تھی۔ کوئی اس کا سر پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے اسے کھینچتا ہوا لے جارہا تھا اور اسے پور طرح سانس لینے کا موقع دے رہا تھا۔

کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک زینہ تھا جو پہلی منزل تک گیا تھا۔ کسی نے کہا "زینے کی ریلنگ پکڑو اور اوپر چڑھو۔"

وہ فرشتے کی مدد سے زینے پر چڑھ کر اوپر آئی پھر پچھلا دروازہ کھول کر ایک راہداری میں آئی۔ اچانک روشنی ہوگئی۔ اسے بچانے والے نے ٹارچ روشن کی تھی۔ وہ ٹرک کے ایک پھٹنے والے ٹیوب کو فرش پر رکھ رہا تھا۔ اس نے اسی ٹیوب کے ذریعے تیر کر اس کی جان بچائی تھی۔ وہ کوئی سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا۔ چہرہ معصوم مگر پرعزم تھا۔ اس نے پوچھا "باجی! آپ کیسے گر پڑی تھیں؟"

فیروزہ نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھ کر نوجوان کو آغوش میں لیا۔ اسے سینے سے لگا کر بولی "میرے ویر! تیرے جیسے جوانوں سے ابھی بہنوں کے دوپٹے سلامت ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن اب اتنی زندگی نہیں رہی کہ تیرا احسان یاد رکھ سکوں۔"

"باجی! آپ کیا کہہ رہی ہیں' کیا آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں میرے بھولے ویر! ایک احسان اور کر' یہ ٹارچ مجھے دے دے۔"

"آپ لے لیں میرے پاس ایک اور ٹارچ ہے۔"

وہ اسے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی "اب تو یہاں سے جا مجھے بڑا کام پڑا ہے۔"

وہ ٹرک کا ٹیوب اٹھا کر دروازے سے باہر گیا۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ ٹارچ بجھادی۔ ابھی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بڑے سائز کی ٹارچ سے بہت تیز روشنی خارج ہوتی تھی۔ اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی اکبر نیچے آتے ہوئے روشنی کو دیکھ کر بدک سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دشمن کو اس کی ناکامی کا علم ہو۔

اس کوٹھی کا ہر حصہ جانا پہچانا تھا۔ وہ تاریکی میں راستہ ٹٹول کر اس حصے کی طرف جانے لگی جدھر چھت پر جانے والا زینہ تھا۔ وہ اکلوتی موم بتی جو چھت پر کہیں گر پڑی تھی اکبر کو نہیں ملی۔ وہ چھت پر گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے اسے ڈھونڈتا رہا پھر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ نیچے نہیں جانا چاہیے۔ پانی کسی وقت بھی پہلی منزل میں آسکتا ہے۔ اندھیرے میں بھاگ کر پھر چھت پر آنا چاہے گا تو پتا نہیں کہاں ٹکریں کھاتا پھرے گا بہتر ہے چھت پر ہی رہے۔

اچانک ہی چھت پر روشنی ہوگئی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے منہ پھیر کر پوچھا "کون ہے؟"

"جونک!" فیروزہ کی زہریلی آواز سنائی دی۔

وہ دہشت اور حیرانی سے چیخ پڑا "تم... تم زندہ ہو؟"

وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا فیروزہ نے ٹارچ کی روشنی میں اپنا دوسرا ہاتھ دکھایا۔ اس ہاتھ میں ایک لانبا چاقو تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ رک گیا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا پردہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹارچ ہٹاؤ۔ مجھے دیکھنے دو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ پھر ایک بار مرنے آئی ہو۔"

وہ پیچھے ہٹنے لگا تاکہ روشنی سے دور ہوسکے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "ہاں میں مرنے ہی آئی ہوں۔ جب اچھی طرح یقین ہوچکا ہے کہ تم مجھے مرتے دم تک عزت و آبرو سے نہیں اپناؤ گے اور میرا بچہ حرام کی اولاد کہلائے گا تو پھر مجھے اور بچے کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ تمہارے ساتھ مرجانا چاہیے۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بالکل منڈیر سے لگ گیا وہ بولی "میں چاقو پھینک رہی ہوں اسے پکڑو اور مجھے مار ڈالو۔"

یہ کہتے ہی اس نے چاقو کو اس کی طرف سر سے اوپر اچھالا ٹارچ کی روشنی میں چاقو ادھر گیا وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے کیچ کرنے ہی والا تھا کہ فیروزہ نے ایک چیخ مار کر ٹارچ کو

پھنکتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ ایسے میں وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے حلق سے بھی چیخ نکلی پھر گہرے پانی میں زوردار چھپاکا سا ہوا اس کے چھینٹے بلندی تک اڑ کر واپس آگئے۔

وہ دونوں ایک جان دو قالب ہو کر پانی کی گہرائی میں چلے گئے۔ اکبر نے تیر کر سطح پر آنے کے لیے فیروزہ کو اپنے جسم سے الگ کرنا چاہا لیکن وہ یوں لپٹی ہوئی تھی کہ دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لے گئی تھی پھر دس انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیا تھا اور اس کی ایک ٹانگ کو اپنی دونوں ٹانگوں میں جکڑ لیا تھا۔

تیرنے کے لیے دونوں ہاتھ پاؤں کا آزاد رہنا لازمی ہے۔ وہ صرف دونوں ہاتھ پانی میں چلا رہا تھا لیکن فیروزہ کے بوجھ سمیت سطح پر ابھر نہیں سکتا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا سانس روکنے کی صلاحیت جواب دے رہی تھی۔ اگر وہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرتا تو شاید وہ معاف کردیتا مگر جونک چمٹ جاتی ہے تو پھر معافی کی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

سوہنی رے سوہنی! جہلم میں بھی تجھے کچا ہی گھڑا ملا۔